منٹو کے سو بہترین افسانے

(افسانے)

حصہ اول

فہرست

آخری سلیوٹ

یہ کشمیر کی لڑائی بھی کچھ عجیب و غریب تھی۔ صوبیدار رب نواز کا دماغ ایسی بندوق بن گیا تھا جس کا گھوڑا خراب ہو گیا ہو۔

پچھلی بڑی جنگ میں وہ کئی محاذوں پر لڑ چکا تھا مارنا اور مرنا جانتا تھا چھوٹے بڑے افسروں کی نظروں میں اس کی بڑی توقیر تھی، اس لیے کہ وہ بڑا بہادر نڈر اور سمجھدار سا ہی تھا۔ پلاٹون کمانڈر مشکل کام ہمیشہ اسے ہی سونپتے تھے اور وہ ان سے عہدہ برآ ہوتا تھا۔ مگر اس لڑائی کا ڈھنگ ہی نرالا تھا دل میں بڑا ولولہ، بڑا جوش تھا۔ بھوک پیاس سے بے پرواہ صرف ایک ہی لگن تھی، دشمن کا صفایا کر دینے کی، مگر جب اس سے سامنا ہوتا تو جانی پہچانی صورتیں نظر آتیں بعض دوست دکھائی دیتے، بڑے بغلی قسم کے دوست، جو پچھلی لڑائی میں اس کے دوش بدوش، اتحادیوں کے دشمنوں سے لڑے تھے، پر اب جان کے پیاسے بنے ہوئے تھے۔

صوبیدار رب نواز سوچتا تھا کہ یہ سب خواب تو نہیں پچھلی بڑی جنگ کا اعلان۔۔۔۔۔بھرتی، قد اور چھاتیوں کی پیمائش، پی ٹی، چاند ماری اور پھر محاذ۔۔۔۔۔ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر، آخر جنگ کا خاتمہ، پھر ایک دم پاکستان کا قیام اور ساتھ ہی کشمیر کی لڑائی، اوپر تلے کتنی چیزیں رب نواز سوچتا تھا کہ کرنے والے نے یہ سب کچھ سوچ سمجھ کر کیا ہے تاکہ دوسرے بوکھلا جائیں اور سمجھ نہ سکیں۔ ورنہ یہ بھی کوئی بات تھی کہ اتنی جلدی اتنے بڑے انقلاب برپا ہو جائیں۔

اتنی بات تو صوبیدار رب نواز کی سمجھ میں آتی تھی کہ وہ کشمیر حاصل کرنے کے لئے لڑ رہے ہیں کشمیر کیوں حاصل کرنا ہے، یہ بھی وہ اچھی طرح سمجھتا تھا اس لیے کہ پاکستان کی بقاء کے لیے اس کا الحاق اشد ضروری ہے، مگر نشانہ باندھتے ہوئے اسے جب کوئی جانی پہچانی شکل نظر آجاتی تھی تو وہ کچھ دیر کے لیے بھول جاتا تھا کہ وہ کس غرض کے لیے لڑ رہا ہے، کس مقصد کے لیے اس نے بندوق اٹھائی ہے، اور وہ یہ غالباً اسی لیے بھولتا تھا کہ اسے بار بار خود کو یاد کرانا پڑتا تھا کہ اب کی وہ صرف تنخواہ، زمین کے مربعوں اور تمغوں کے لیے نہیں بلکہ اپنے وطن کی خاطر لڑ رہا ہے، یہ وطن پہلے بھی اس کا وطن تھا، وہ اسی علاقے کا رہنے والا تھا جو اب پاکستان کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ اب اسے اپنے اسی ہم وطن کے خلاف لڑنا تھا جو کبھی اس کا ہمسایہ ہوتا تھا، جس کے خاندان سے اس کے خاندان کے پشت ہا پشت کے دیرینہ مراسم تھے۔ اب اس کا وطن وہ تھا جس کا پانی تک بھی اس نے کبھی نہیں پیا تھا، پر اب اس کی خاطر، ایک دم اس کے کاندھے پر بندوق رکھ کر یہ حکم دے دیا گیا تھا کہ جاؤ، یہ جگہ جہاں تم نے ابھی اپنے گھر کے لیے دو اینٹیں بھی نہیں چنیں، جس کی ہوا اور جس کے پانی کا مزا ابھی تک تمہارے منہ میں ٹھیک طور پر نہیں بیٹھا، تمہارا وطن ہے۔۔۔۔ جاؤ اس کی خاطر پاکستان سے لڑو۔۔۔۔۔۔۔ اس پاکستان سے جس کے عین دل میں تم نے اپنی عمر کے اتنے برس گزارے ہیں۔

رب نواز سوچتا تھا کہ یہی حال ان مسلمان فوجیوں کا ہے جو ہندوستان میں اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں آئے ہیں وہاں ان سب سے سب کچھ چھین لیا گیا تھا یہاں آ کر انہیں اور تو کچھ نہیں ملا البتہ بندوقیں مل گئی ہیں۔ اسی وزن کی، اسی شکل کی، اسی

مار کہ اور چھاپ کی۔

پہلے سب مل کر ایک ایسے دشمن سے لڑتے تھے جن کو انہوں نے پیٹ اور انعام واکرام کی خاطر اپنا دشمن یقین کر لیا تھا۔ اب وہ خود دو حصوں میں بٹ گئے تھے۔ پہلے سب ہندوستانی فوج کہلاتے تھے اب ایک پاکستانی تھا اور دوسرا ہندوستانی۔ ادھر ہندوستان میں مسلمان ہندوستانی فوج تھے رب نواز جب ان کے متعلق سوچتا تو اس کے دماغ میں ایک عجیب گڑبڑ سی پیدا ہو جاتی۔ اور جب وہ کشمیر کے متعلق سوچتا تو اس کا دماغ بالکل جواب دے جاتا۔۔۔۔۔۔۔۔ پاکستانی فوجی کشمیر کے لیے لڑ رہے تھے یا کشمیر کے مسلمانوں کے لیے؟ اگر انہیں کشمیر کے مسلمانوں ہی کے لیے لڑایا جاتا تھا تو حیدر آباد، اور جونا گڑھ کے مسلمانوں کے لیے کیوں انہیں لڑنے کے لیے نہیں کہا جاتا تھا اور اگر یہ جنگ ٹھیٹ اسلامی جنگ تھی تو دنیا میں دوسرے اسلامی ملک ہیں وہ اس میں کیوں حصہ نہیں لیتے۔

رب نواز بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ یہ باریک باریک باتیں فوجی کو بالکل نہیں سوچنا چاہئیں اس کی عقل موٹی ہونی چاہئے۔ کیونکہ موٹی عقل والا ہی اچھا سپاہی ہو سکتا ہے، مگر فطرت سے مجبور کبھی کبھی وہ چور دماغ سے ان پر غور کر ہی لیتا تھا اور بعد میں اپنی اس حرکت پر خوب ہنستا تھا۔

دریائے کشن گنگا کے کنارے اس سڑک کے لیے جو مظفر آباد سے کرن جاتی ہے۔ کچھ عرصے سے لڑائی ہو رہی تھی۔۔۔۔ عجیب وغریب لڑائی تھی رات کو بعض اوقات آس پاس پہاڑیاں فائروں کے بجائے گندی گندی گالیوں سے گونج اٹھتی تھیں۔

ایک مرتبہ صوبیدار رب نواز اپنی پلاٹون کے جوانوں کے ساتھ شب خون

مارنے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ دور نیچے ایک کھائی سے گالیوں کا شور اٹھا پہلے تو وہ گھبرا گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ بہت سے بھوت مل کر ناچ رہے ہیں اور زور زور کے قہقہے لگا رہے ہیں وہ بڑبڑایا ''خنزیر کی دم ۔۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔''

ایک جوان نے گونجتی ہوئی آوازوں سے مخاطب ہو کر یہ بڑی گالی دی اور رب نواز سے کہا ''صوبیدار صاحب گالیاں دے رہے ہیں اپنی ماں کے یار''

رب نواز یہ گالیاں سن رہا تھا جو بہت اکسانے والی تھیں اس کے جی میں آئی کہ بزن بول دے مگر ایسا کرنا غلطی تھی، چنانچہ وہ خاموش رہا۔ کچھ دیر جوان بھی چپ رہے، مگر جب پانی سر سے گزر گیا تو انہوں نے بھی گلا پھاڑ پھاڑ کے گالیاں لڑھکانا شروع کر دیں ۔۔۔۔۔۔ رب نواز کے لیے اس قسم کی لڑائی بالکل نئی چیز تھی۔ اس نے جوانوں کو دو تین مرتبہ خاموش رہنے کے لیے کہا، مگر گالیاں ہی کچھ ایسی تھیں کہ جواب دیئے بنا انسان سے نہیں رہا جاتا تھا۔

دشمن کے سپاہی نظر سے اوجھل تھے رات کو تو خیر اندھیرا تھا، مگر وہ دن کو بھی نظر نہیں آتے تھے۔ صرف ان کی گالیاں نیچے پہاڑی کے قدموں سے اٹھتی تھیں اور پتھروں کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر ہوا میں چلی جاتی تھیں۔ رب نواز کی پلاٹون کے جوان جب ان گالیوں کا جواب دیتے تھے تو اس کو ایسا لگتا تھا کہ وہ نیچے نہیں جاتیں، اوپر کو اڑ جاتی ہیں اس سے اس کو خاصی کوفت ہوتی تھی ۔۔۔۔ چنانچہ اس نے جھنجھلا کر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔

رب نواز کو وہاں کی پہاڑیوں میں ایک عجیب بات نظر آئی تھی۔ چڑھائی کی طرف کوئی پہاڑی درختوں اور بوٹوں سے لدی پھندی ہوتی تھی اور اترائی کی

طرف گنجی کشمیری بتو کے سر کی طرح۔ کسی کی چڑھائی کا حصہ گنجا ہوتا تھا اور اترائی کی طرف درخت ہی درخت ہوتے تھے چیڑ کے لمبے تناور درخت، جن کے بچے ہوئے دھاگے جیسے پتوں پر فوجی بوٹ پھسل پھسل جاتے تھے۔

جس پہاڑی پر صوبیدار رب نواز کی پلاٹون تھی، اس کی اترائی درختوں اور جھاڑیوں سے بے نیاز تھی۔ ظاہر ہے کہ حملہ بہت ہی خطرناک تھا مگر سب جوان بخوشی تیار تھے۔ گالیوں کا انتقام لینے کے لیے وہ بہت بے تاب تھے۔ حملہ ہوا اور کامیاب رہا۔ دو جوان مارے گئے۔ چار زخمی ہوئے، دشمن کے تین آدمی کھیت رہے، باقی رسد کا کچھ سامان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

صوبیدار رب نواز اور اس کے جوانوں کو اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ دشمن کا کوئی زندہ سپاہی ان کے ہاتھ نہ آیا جس کو وہ خاطر خواہ گالیوں کا مزا چکھاتے۔ مگر یہ مورچہ فتح کرنے سے وہ ایک بڑی اہم پہاڑی پر قابض ہو گئے تھے۔ وائرلیس کے ذریعے سے صوبیدار رب نواز نے پلاٹون کمانڈر میجر اسلم کو فوراً ہی اپنے حملے کے اس نتیجے سے مطلع کر دیا تھا اور شاباش وصول کر لی تھی۔

قریب قریب ہر پہاڑی کی چوٹی پر پانی کا ایک تالاب سا ہوتا تھا۔ اس پہاڑی پر بھی تالاب تھا، مگر دوسری پہاڑیوں کے تالابوں کے مقابلے میں زیادہ بڑا اس کا پانی بھی بہت صاف اور شفاف تھا۔ گو موسم سخت سرد تھا۔ مگر سب نہائے، دانت بجتے رہے مگر انہوں نے کوئی پرواہ نہ کی۔ وہ ابھی اس شغل میں مصروف تھے کہ فائر کی آواز آئی۔ سب ننگے ہی لیٹ گئے تھوڑی دیر کے بعد صوبیدار رب نواز خاں نے دوربین لگا کر نیچے ڈھلوانوں پر نظر دوڑائی، مگر اسے دشمن کے چھپنے کی

جگہ کا پتا نہ چلا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے ایک اور فائر ہوا دور اترائی کے فوراً بعد ایک نسبتاً چھوٹی پہاڑی کی واڑھی سے اسے دھواں اٹھتا نظر آیا اس نے فوراً ہی اپنے جوانوں کو فائر کا حکم دیا۔

ادھر سے دھڑا دھڑ فائر ہوئے، ادھر سے بھی جواباً گولیاں چلنے لگیں۔۔۔صوبیدار رب نواز نے دوربین سے دشمن کی پوزیشن کا بغور مطالعہ کیا وہ غالباً بڑے بڑے پتھروں کے پیچھے محفوظ تھے۔ مگر یہ محافظ دیوار بہت ہی چھوٹی تھی زیادہ دیر تک وہ جمے نہیں رہ سکتے تھے۔ ان میں سے جو بھی ادھر ادھر ہٹتا، اس کا صوبیدار رب نواز کی زد میں آنا یقینی تھا۔

تھوڑی دیر فائر ہوتے رہے۔ اس کے بعد رب نواز نے اپنے جوانوں کو منع کر دیا کہ وہ گولیاں ضائع نہ کریں صرف تاک میں رہیں جونہی دشمن کا کوئی سپاہی پتھروں کی دیوار سے نکل کر ادھر یا ادھر جانے کی کوشش کرے اس کو اڑا دیں۔ یہ حکم کر اس نے اپنے الف ننگے بدن کی طرف دیکھا اور بڑبڑایا" خنزیر کی دم۔۔۔۔۔۔۔کپڑوں کے بغیر آدمی حیوان معلوم ہوتا ہے۔"

لمبے لمبے وقفوں کے بعد دشمن کی طرف سے اکا دکا فائر ہوتا رہا یہاں سے اس کا جواب کبھی کبھی دے دیا جاتا۔ یہ کھیل پورے دو دن جاری رہا۔۔۔۔۔موسم یک لخت بہت سرد ہو گیا۔ اس قدر سرد کہ دن کو بھی خون منجمد ہونے لگتا تھا، چنانچہ صوبیدار رب نواز نے چائے کے دور شروع کرا دیئے۔ ہر وقت آگ پر کیتلی دھری رہتی۔ جونہی سردی زیادہ ستاتی ایک دور اس گرم گرم مشروب کا ہو جاتا۔ ویسے دشمن پر برابر نگاہ تھی۔ ایک ہٹتا تو دوسرا اس کی جگہ دوربین لے کر بیٹھ جاتا۔

ہڈیوں تک اتر جانے والی سرد ہوا چل رہی تھی۔ جب اس جوان نے جو پہرے دار تھا، بتایا کہ پتھروں کی دیوار کے پیچھے کچھ گڑبڑی ہو رہی ہے۔ صوبیدار رب نواز نے اس سے دوربین لی اور غور سے دکھا۔ اسے حرکت نظر نہ آئی لیکن فوراً ہی ایک آواز بلند ہوئی اور دیر تک اس کی گونج آس پاس کی پہاڑیوں کے ساتھ ٹکراتی رہی۔ رب نواز اس کا مطلب نہ سمجھا اس کے جواب میں اس نے اپنی بندوق داغ دی۔ اس کی گونج دبی تو پھر ادھر سے آواز بلند ہوئی، جو صاف طور پر ان سے مخاطب تھی رب نواز چلایا ''خنزیر کی دم بول کیا کہتا ہے تو!''

فاصلہ زیادہ نہیں تھا رب نواز کے الفاظ دشمن تک پہنچ گئے، کیونکہ وہاں سے کسی نے کہا ''گالی نہ دے بھائی''

رب نواز نے اپنے جوانوں کی طرف دیکھا اور بڑے جھنجلائے ہوئے تعجب کے ساتھ کہا ''بھائی؟------'' پھر وہ اپنے منہ کے آگے دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنا کر چلایا ''بھائی ہوگا تیری ماں کا جنا--------یہاں سب تیری ماں کے یار ہیں!''

ایک دم ادھر سے ایک زخمی آواز بلند ہوئی ''رب نواز!''

رب نواز کانپ گیا------یہ آواز آس پاس کی پہاڑیوں سے سر پھوڑتی رہی اور مختلف انداز میں، رب نواز------رب نواز، دہراتی بالآخر خون منجمد کردینے والی سرد ہوا کے ساتھ جانے کہاں اڑ گئی۔

رب نواز بہت دیر کے بعد چونکا ''یہ کون تھا'' پھر وہ آہستہ سے بڑبڑایا ''خنزیر کی دم!''

اس کو اتنا معلوم تھا ٹیٹوال کے محاذ پر سپاہیوں کی اکثریت 2/9 رجمنٹ کی ہے۔ وہ بھی اسی رجمنٹ میں تھا۔ مگر یہ آواز تھی کس کی؟ وہ ایسے بے شمار آدمیوں کو جانتا تھا۔ جو کبھی اس کے عزیز ترین دوست تھے کچھ ایسے بھی جن سے اس کی دشمنی تھی، چند ذاتی اغراض کی بناء پر لیکن یہ کون تھا جس نے اس کی گالی کا برا مان کر اسے چیخ کر پکارا تھا۔

رب نواز نے دوربین لگا کر دیکھا، مگر پہاڑی کی ہلتی ہوئی چھدری داڑھی میں اسے کوئی نظر نہ آیا۔ دونوں ہاتھ کا بھونپو بنا کر اس نے زور سے اپنی آواز ادھر پھینکی ''یہ کون تھا؟۔۔۔رب نواز بول رہا ہے۔۔۔۔۔رب نواز۔۔۔۔۔۔۔۔رب نواز''

یہ رب نواز، بھی کچھ دیر تک پہاڑیوں کے ساتھ ٹکراتا رہا۔ رب نواز بڑبڑایا ''خنزیر کی دم!'' فوراً ہی ادھر سے آواز بلند ہوئی ''میں ہوں۔۔۔۔میں ہوں رام سنگھ!''

رب نواز یہ سن کر یوں اچھال جیسے وہ چھلانگ لگا کر دوسری طرف جانا چاہتا ہے پہلے اس نے اپنے آپ سے کہا ''رام سنگھ؟'' پھر حلق پھاڑ کے چلایا ''رام سنگھ؟۔۔۔۔اوئے رام سنگھا۔۔۔۔۔۔خنزیر کی دم!''

''خنزیر کی دم'' ابھی پہاڑیوں کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر پوری طرح گم نہیں ہوئی تھی کہ رام سنگھ کی پھٹی پھٹی آواز بلند ہوئی ''اوئے کمہار کے کھوتے!''

رب نواز پھوں پھوں کرنے لگا جوانوں کی طرف رعب دار نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ بڑبڑایا ''بکتا ہے۔۔۔خنزیر کی دم!'' پھر اس نے رام سنگھ کو جواب دیا ''

اوئے باباٹ کے کڑاہ پرشاد۔۔۔۔اوئے خنزیر کے جھٹکے''

رام سنگھ بے تحاشا قہقہے لگانے لگا۔ رب نواز بھی زور زور سے ہنسنے لگا۔ پہاڑیاں یہ آوازیں بڑے کھلنڈرے انداز میں ایک دوسرے کی طرف اچھالتی رہیں۔۔۔۔صوبیدار رب نواز کے جوان خاموش تھے۔

جب ہنسی کا دورہ ختم ہوا تو ادھر سے رام سنگھ کی آواز بلند ہوئی ''دیکھو یار ہمیں چائے پینی ہے!''

رب نواز بولا ''پیو۔۔۔۔عیش کرو''

رام سنگھ چلایا ''اوئے عیش کس طرح کریں۔۔۔۔سامان تو ہمارا ادھر پڑا ہے''

رب نواز نے پوچھا ''کدھر''

رام سنگھ کی آواز آئی ''ادھر۔۔۔۔جدھر تمہارا فائر ہمیں اڑا سکتا ہے''

رب نواز ہنسا ''تو کیا چاہتے ہو تم۔۔۔۔خنزیر کی دم!''

رام سنگھ بولا ''ہمیں سامان لے آنے دے''

''لے آ!'' یہ کہہ کر اس نے اپنے جوانوں کی طرف دیکھا

رام سنگھ کی تشویش بھری آواز بلند ہوئی ''تو اڑا دے گا کمہار کے کھوتے!''

رب نواز نے بھنا کر کہا ''بک نہیں اوئے سنتو کھسر کے پھوڑے''

رام سنگھ ہنسا ''قسم کھا نہیں مارے گا!''

رب نواز نے پوچھا ''کس کی قسم کھاؤں!''

رام سنگھ نے کہا ''کسی کی بھی کھالے!''

رب نواز ہنسا ’’اوئے جا۔۔۔۔۔منگوا لے اپنا سامان‘‘

چند لمحات خاموشی رہی، دوربین ایک جوان کے ہاتھ میں تھی اس نے معنی خیز نظروں سے صوبیدار رب نواز کی طرف دیکھا۔ بندوق چلانے ہی والا تھا کہ رب نواز نے اسے منع کیا ’’نہیں۔۔۔۔۔نہیں!‘‘

پھر اس نے دوربین لے کر خود ہی دیکھا۔ایک آدمی ڈرتے ڈرتے پنجوں کے بل پتھروں کے عقب سے نکل کر جا رہا تھا۔تھوڑی دور اس طرح چل کر وہ اٹھا اور تیزی سے بھاگا اور کچھ دور جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ دو منٹ کے بعد واپس آیا تو اس کے دونوں ہاتھوں میں کچھ سامان تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ رکا۔ پھر تیزی سے پتھروں کی محفوظ دیوار کی طرف بھاگا اور بالآخر وہاں پہنچ گیا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوا تو رب نواز نے اپنی بندوق چلا دی۔ تڑاخ کے ساتھ ہی رب نواز کا قہقہہ بلند ہوا۔ یہ دونوں آوازیں مل کر کچھ دیر جھنجھناتی رہیں۔ پھر رام سنگھ کی آواز آئی ’’تھینک یو۔‘‘

’’نو مینشن‘‘ رب نواز نے یہ کہہ کر جوانوں کی طرف دیکھا ’’ایک راؤنڈ ہو جائے‘‘

تفریح کے طور پر دونوں طرف سے گولیاں چلنے لگیں۔۔۔۔۔۔۔پھر خاموشی ہو گئی رب نواز نے دوربین لگا کر دیکھا پہاڑی کی داڑھی میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہ پکارا ’’چائے تیار کر لی رام سنگھا؟‘‘

جواب آیا ’’ابھی کہاں اوئے لمہار کے کھوتے!‘‘

رب نواز ذات کا کمہار تھا جب کوئی اس کی طرف اشارہ کرتا تھا تو غصے سے اس

کا خون کھولنے لگتا تھا۔ ایک صرف رام سنگھ کے منہ سے وہ اسے برداشت کر لیتا تھا اس لیے کہ وہ اس کا بے تکلف دوست تھا۔ ایک ہی گاؤں میں وہ پل کر جوان ہوئے تھے۔ دونوں کی عمر میں صرف چند دن کا فرق تھا۔ دونوں کے باپ، پھر ان کے باپ بھی ایک دوسرے کے دوست تھے۔ ایک ہی سکول میں پرائمری تک پڑھتے تھے اور ایک ہی دن فوج میں بھرتی ہوئے تھے اور پچھلی بڑی جنگ میں کئی محاذوں پر اکٹھے لڑے تھے۔

رب نواز اپنے جوانوں کی نظروں میں خود کو خفیف محسوس کر کے بڑبڑایا ''خنزیر کی دم۔۔۔۔۔اب بھی باز نہیں آتا۔'' پھر وہ رام سنگھ سے مخاطب ہوا ''بک نہیں اوئے کھوتے کی جوں۔''

رام سنگھ کا قہقہہ بلند ہوا رب نواز نے ایسے ہی شست باندھی ہوئی تھی تفریحاً اس نے لبلبی دبا دی تڑاخ کے ساتھ ہی ایک فلک شگاف چیخ بلند ہوئی۔ رب نواز نے فوراً دوربین لگائی اور دیکھا کہ ایک آدمی نہیں، رام سنگھ پیٹ پکڑے، پتھروں کی دیوار سے ذرا ہٹ کر دوہرا ہوا اور گر پڑا۔

رب نواز زور سے چیخا ''رام سنگھ! اور اچھل کر کھڑا ہو گیا، ادھر سے بیک وقت تین چار فائر ہوئے ایک گولی رب نواز کا دایاں بازو چاٹتی ہوئی نکل گئی۔ فوراً ہی وہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ اب دونوں طرف سے فائر شروع ہو گئے۔ ادھر کچھ سپاہیوں نے گڑبڑ سے فائدہ اٹھا کر پتھروں کے عقب سے نکل بھاگنا چاہا۔ ادھر سے فائر جاری تھے مگر نشانے پر کوئی نہ بیٹھا۔ رب نواز نے اپنے جوانوں کو اترنے کا حکم دیا تین فوراً ہی مارے گئے، لیکن افتاں وخیزاں باقی جوان دوسری پہاڑی پر پہنچ

گئے۔''

رام سنگھ خون میں لت پت پتھریلی زمین پر پڑا کراہ رہا تھا گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی رب نواز کو دیکھ کر اس کی آنکھیں تمتما اٹھیں مسکرا کر اس نے کہا ''اوئے کمہار کے کھوتے، یہ تو نے کیا کیا۔''

رب نواز، رام سنگھ کا زخم اپنے پیٹ میں محسوس کر رہا تھا، لیکن وہ مسکرا کر اس پر جھکا اور دو زانو ہو کر اس کی پٹی کھولنے لگا ''خنزیر کی دم، تم سے کس نے باہر نکلنے کو کہا تھا۔''

پٹی اتارنے سے رام سنگھ کو سخت تکلیف ہوئی۔ درد سے وہ چلا چلا پڑا۔ جب پٹی اتر گئی اور رب نواز نے زخم کا معائنہ کیا جو بہت خطرناک تھا تو رام سنگھ نے رب نواز کا ہاتھ دبا کر کہا'' میں اپنا آپ دکھانے کے لیے باہر نکلا تھا کہ تو نے۔۔۔۔ اوئے رب کے پتر۔۔۔۔ فائر کر دیا۔''

رب نواز کا گلا رندھ گیا ''قسم وحدہ، لاشریک کی۔۔۔۔ میں نے ایسے ہی بندوق چلائی تھی۔۔۔۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تو کھوتے کا سنگھ باہر نکل رہا ہے۔۔۔ مجھے افسوس ہے!''

رام سنگھ کا خون کافی بہہ نکلا تھا۔ رب نواز اور اس کے ساتھی کئی گھنٹوں کے بعد وہاں پہنچے تھے۔ اس عرصے تک تو ایک پوری مشک خون کی خالی ہو سکتی تھی۔ رب نواز کو حیرت تھی کہ اتنی دیر تک رام سنگھ زندہ رہ سکا ہے۔ اس کو امید نہیں تھی کہ وہ بچے گا۔ ہلانا جلانا غلط تھا، چنانچہ اس نے فوراً وائرلیس کے ذریعے سے پلاٹون کمانڈر سے درخواست کی کہ جلدی ایک ڈاکٹر روانہ کیا جائے۔ اس کا دوست رام

سنگھ زخمی ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر کا وہاں تک پہنچنا اور پھر وقت پر پہنچنا بالکل محال تھا۔ رب نواز کو یقین تھا کہ رام سنگھ صرف چند گھڑیوں کا مہمان ہے پھر بھی وائرلیس پر پیغام پہنچا کر اس نے مسکرا کر رام سنگھ سے کہا "ڈاکٹر آ رہا ہے۔۔۔۔ کوئی فکر نہ کر۔"

رام سنگھ بڑی نحیف آواز میں سوچتے ہوئے بولا "فکر کسی بات کی نہیں۔۔۔۔۔۔ یہ بتا میرے کتنے جوان مارے ہیں تم لوگوں نے؟"

رب نواز نے جواب دیا "صرف ایک!"

رام سنگھ کی آواز اور زیادہ نحیف ہو گئی تیرے کتنے مارے گئے؟

رب نواز نے جھوٹ بولا "چھ!" اور یہ کہہ کر اس نے معنی خیز نظروں سے اپنے جوانوں کی طرف دیکھا۔

"چھ۔۔۔۔۔ چھ!" رام سنگھ نے ایک ایک آدمی اپنے دل میں گنا "میں زخمی ہوا تو وہ بہت بد دل ہو گئے تھے۔۔۔۔ پر میں نے کہا۔۔۔۔۔۔ کھیل جاؤ اپنی اور دشمن کی جان سے۔۔۔۔ چھ۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے!" وہ پھر ماضی کے دھندلکوں میں چلا گیا "رب نواز۔۔۔۔ یاد ہیں وہ دن تمہیں۔۔۔۔۔"

اور رام سنگھ نے بیتے دن یاد کرنے شروع کر دیئے۔ کھیتوں کھلیانوں کی باتیں سکول کے قصے 2/9 جاٹ رجمنٹ کی داستانیں۔۔۔۔۔ کمانڈنگ افسروں کے لطیفے اور باہر کے ملکوں میں اجنبی عورتوں سے معاشقے ان کا ذکر کرتے ہوئے رام سنگھ کو کوئی بہت دلچسپ واقعہ یاد آ گیا۔ ہنسنے لگا تو اس کے ٹیس اٹھی مگر اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ زخم سے اوپر ہی اوپر ہنس کر کہنے لگا "اوئے سور کے

نل۔۔۔۔یاد ہے تمہیں وہ مڈم۔۔۔۔۔"

رب نواز نے پوچھا "کون؟"

رام سنگھ نے کہا "وہ۔۔۔۔۔۔اٹلی کی۔۔۔۔کیا نام رکھا تھا ہم نے اس کا۔۔۔۔۔۔بڑی مارخور عورت تھی!"

رب نواز کو فوراً ہی وہ عورت یاد آ گئی "ہاں، ہاں۔۔۔۔۔۔۔۔وہ۔۔۔۔۔۔مڈام منیتا فنتو۔۔۔ پیسہ ختم،۔تماشا ختم۔۔۔۔پر تجھ سے کبھی کبھی رعایت کر دیتی تھی مسولینی کی بچی!"

رام سنگھ زور سے ہنسا۔۔۔۔۔اور اس کے زخم سے جمے ہوئے خون کا ایک لوتھڑا نکل آیا سرسری طور پر رب نواز نے جو پٹی باندھی تھی وہ کھسک گئی تھی اسے ٹھیک کر کے اس نے رام سنگھ سے کہا "اب خاموش رہو"

رام سنگھ کو بہت تیز بخار تھا۔اس کا دماغ اس کے باعث بہت تیز ہو گیا تھا بولنے کی طاقت نہیں تھی مگر بولے چلا جا رہا تھا۔کبھی کبھی رک جاتا۔جیسے یہ دیکھ رہا ہے کہ ٹینکی میں کتنا پٹرول باقی ہے کچھ دیر کے بعد اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی، لیکن کچھ ایسے وقفے بھی آتے تھے کہ اس کے ہوش و حواس سلامت ہوتے تھے۔انہی وقفوں میں اس نے ایک مرتبہ رب نواز سے سوال کیا "یار! سچ سچ بتا، کیا تم لوگوں کو واقعی کشمیر چاہیئے!"

رب نواز نے پورے خلوص کے ساتھ کہا "ہاں، رام سنگھا!"

رام سنگھ نے اپنا سر ہلایا "نہیں۔۔۔۔۔میں نہیں مان سکتا۔۔۔۔۔تمہیں ورغلایا گیا ہے۔"

رب نواز نے اس کو یقین دلانے کے انداز میں کہا ''تمہیں ورغلایا گیا ہے۔۔۔۔۔قسم پنجتن پاک کی۔۔۔۔''

رام سنگھ نے رب نواز کا ہاتھ پکڑ لیا ''قسم نہ کھا یارا۔۔۔۔۔ٹھیک ہو گا'' لیکن اس کا لہجہ صاف بتا رہا تھا کہ اس کو رب نواز کی قسم کا یقین نہیں۔

دن ڈھلنے سے کچھ دیر پہلے پلاٹون کمانڈنٹ میجر اسلم آیا اس کے ساتھ چند سپاہی تھے، مگر ڈاکٹر نہیں تھا۔ رام سنگھ بے ہوشی اور نزع کی حالت میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ مگر آواز اس قدر کمزور اور شکستہ تھی کہ سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ میجر اسلم بھی 2/9 جاٹ رجمنٹ کا تھا اور رام سنگھ کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ رب نواز سے سارے حالات دریافت کرنے کے بعد اس نے رام سنگھ کو بلایا۔۔۔۔''رام سنگھ۔۔۔۔۔رام سنگھ!''

رام سنگھ نے اپنی آنکھیں کھولیں لیٹے لیٹے اٹینشن ہو کر اس نے سلیوٹ کیا لیکن پھر آنکھیں کھول کر اس نے ایک لحظے کے لیے غور سے میجر اسلم کی طرف دیکھا اس کا سلیوٹ کرنے والا اکڑا ہوا ہاتھ ایک دم گر پڑا۔ جھنجھلا کر اس نے بڑبڑانا شروع کیا'' کچھ نہیں اوئے رام سیاں۔۔۔۔بھول ہی گیا تو سور کے تلا۔۔۔۔کہ یہ لڑائی۔۔۔۔۔یہ لڑائی؟''

رام سنگھ اپنی بات پوری نہ کر سکا بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے اس نے رب نواز کی طرف نیم سوالیہ انداز میں دیکھا اور سرد ہو گیا۔

8 اکتوبر 1951ء

☆☆☆☆☆☆

آنکھیں

اس کے سارے جسم میں مجھے اس کی آنکھیں بہت پسند تھیں!

یہ آنکھیں بالکل ایسی ہی تھیں جیسے اندھیری رات میں موٹر کار کی ہیڈ لائٹس، جن کو آدمی سب سے پہلے دیکھتا ہے، آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ وہ بہت خوبصورت آنکھیں تھیں۔ ہرگز نہیں، میں خوبصورتی اور بدصورتی میں تمیز کرسکتا ہوں لیکن معاف کیجئے گا، ان آنکھوں کے معاملے میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ خوبصورت نہیں تھیں لیکن اس کے باوجود ان میں بے پناہ کشش تھی۔

میری اور ان آنکھوں کی ملاقات ایک ہسپتال میں ہوئی۔ میں اس ہسپتال کا نام آپ کو بتانا نہیں چاہتا، اس لیے کہ اس سے میرے اس افسانے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا

بس آپ یہی سمجھ لیجئے کہ ایک ہسپتال تھا، جس میں میرا ایک عزیز آپریشن کرانے کے بعد اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا۔

یوں تو میں رواروی کا قائل نہیں، مریضوں کے پاس جا کر ان کو دم دلاسہ دینا بھی مجھے نہیں آتا۔ لیکن اپنی بیوی کے پیہم اصرار پر مجھے جانا پڑا تاکہ میں اپنے مرنے والے عزیز کو اپنے خلوص اور اپنی محبت کا ثبوت دے سکوں۔

یقین مانئے کہ مجھے سخت کوفت ہورہی تھی۔ ہسپتال کے نام ہی سے مجھے نفرت ہے، معلوم نہیں کیوں ــــــ شاید اس لیے کہ ایک بار بمبئی میں اپنی بوڑھی ہمسائی کو جس کی کلائی میں موچ آگئی تھی، مجھے جے جے ہسپتال میں لے جانا پڑا

تھا۔ وہاں کیوژوالٹی ڈیپارٹمنٹ میں مجھے کم از کم ڈھائی گھنٹے انتظار کرنا پڑا تھا وہاں میں جس آدمی سے بھی ملا، لوہے کے مانند سرد اور بے حس تھا۔

میں ان آنکھوں کا ذکر کر رہا تھا جو مجھے بے حد پسند تھیں۔

پسند کا معاملہ انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ بہت ممکن ہے، اگر آپ یہ آنکھیں دیکھتے تو آپ کے دل و دماغ میں کوئی ردعمل پیدا نہ ہوتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ سے اگر ان کے بارے میں رائے طلب کی جاتی تو آپ کہہ دیتے ''نہایت واہیات آنکھیں ہیں''لیکن جب میں نے اس لڑکی کو دیکھا، تو سب سے پہلے مجھے اس کی آنکھوں نے اپنی طرف متوجہ کیا۔

وہ برقع پہنے ہوئے تھی، مگر نقاب اٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دوا کی ایک بوتل تھی اور وہ جنرل وارڈ کے برآمدے میں ایک چھوٹے سے لڑکے کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں جو بڑی تھیں، نہ چھوٹی، سیاہ تھیں نہ بھوری، نیلی تھیں نہ سبز، ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہوئی۔ میرے قدم رک گئے وہ بھی ٹھہر گئے اس نے اپنے ساتھی لڑکے کا ہاتھ پکڑا اور بوکھلائی ہوئی آواز میں کہا ''تم سے چلا نہیں جاتا!''

لڑکے نے اپنی کلائی چھڑائی اور تیزی سے کہا ''چل تو رہا ہوں۔۔۔۔۔۔ تو تو اندھی ہے!''

میں نے یہ سنا تو اس لڑکی کی آنکھوں کی طرف دوبارہ دیکھا اس کے سارے وجود میں صرف اس کی آنکھیں ہی تھیں جو مجھے پسند آئی تھیں

میں آگے بڑھا اور اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے مجھے پلکیں نہ جھپکنے والی آنکھوں سے دیکھا اور پوچھا ''ایکسرے کہاں لیا جاتا ہے؟''

اتفاق کی بات ہے کہ ان دنوں ایکسرے ڈیپارٹمنٹ میں میرا ایک دوست کام کر رہا تھا، اور میں اسی سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ میں نے اس لڑکی سے کہا'' آؤ، میں تمہیں وہاں لے چلتا ہوں میں بھی ادھر ہی جا رہا ہوں۔''

لڑکی نے اپنے ساتھی لڑکے کا ہاتھ پکڑا اور میرے ساتھ چل پڑی۔ میں نے ڈاکٹر صادق کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ ایکسرے لینے میں مصروف ہیں۔

دروازہ بند تھا اور باہر مریضوں کی ایک بھیڑ لگی تھی۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے تیز وتند آواز آئی ''کون ہے ــــــ دروازہ مت ٹھوکو''

لیکن میں نے پھر دستک دی۔ دروازہ کھلا اور ڈاکٹر صادق مجھے گالی دیتے دیتے رہ گیا'' اوہ ــــ تم ہو!''

''ہاں بھئی ــــ میں تم سے ملنے آیا تھا۔ دفتر میں گیا تو معلوم ہوا کہ تم یہاں ہو''

'' آجاؤ اندر!''

میں نے لڑکی کی طرف دیکھا اور اس سے کہا'' آؤ ــــــ لیکن لڑکے کو باہر ہی رہنے دو!''

ڈاکٹر صادق نے ہولے سے مجھ سے پوچھا ''کون ہے یہ؟''

میں نے جواب دیا'' معلوم نہیں، کون ہے ــــ ایکسرے ڈیپارٹمنٹ کا پوچھ رہی تھی میں نے کہا چلو، میں لیے چلتا ہوں''

ڈاکٹر صادق نے دروازہ اور زیادہ کھول دیا۔ میں اور وہ لڑکی اندر داخل ہو گئے۔

چار پانچ مریض تھے ڈاکٹر صادق نے جلدی جلدی ان کی سکریننگ کی، اور انہیں رخصت کیا۔ اس کے بعد کمرے میں ہم صرف دو رہ گئے میں اور وہ لڑکی۔

ڈاکٹر صادق نے مجھ سے پوچھا ''انہیں کیا بیماری ہے؟''

میں نے اس لڑکی سے پوچھا ''کیا بیماری ہے تمہیں؟۔۔۔۔۔ ایکسرے کے لیے تم سے کس ڈاکٹر نے کہا تھا؟''

اندھیرے کمرے میں لڑکی نے میری طرف دیکھا اور جواب دیا ''مجھے معلوم نہیں، کیا بیماری ہے۔۔۔۔۔۔ ہمارے محلے میں ایک ڈاکٹر ہے۔ اس نے کہا تھا کہ ایکسرے کرالو''

ڈاکٹر صادق نے اس سے کہا کہ مشین کی طرف آئے۔ وہ آگے بڑھی تو بڑے زور کے ساتھ اس سے ٹکرا گئی۔ ڈاکٹر نے تیز لہجے میں اس سے کہا۔۔۔۔۔۔ ''کیا تمہیں سجھائی نہیں دیتا۔''

لڑکی خاموش رہی۔ ڈاکٹر نے اس کا برقع اتارا اور اسکرین کے پیچھے کھڑا کر دیا۔ پھر اس نے سوئچ اون کیا۔ میں نے شیشے میں دیکھا تو مجھے اس کی پسلیاں نظر آئیں۔ اس کا دل بھی ایک کونے میں کالے سے دھبے کی صورت میں دھڑک رہا تھا۔

ڈاکٹر صادق پانچ چھ منٹ تک اس کی پسلیوں اور ہڈیوں کو دیکھتا رہا اس کے بعد اس نے سوئچ آف کر دیا اور روشنی کر کے مجھ سے مخاطب ہوا ''چھاتی بالکل

صاف ہے۔“

لڑکی نے معلوم نہیں کیا سمجھا کہ اپنی چھاتیوں پر جو کافی بڑی بڑی تھیں دوپٹے کو درست کیا اور برقع ڈھونڈنے لگی۔

برقع ایک کونے میں میز پر پڑا تھا میں نے بڑھ کر اسے اٹھایا اور اس کے حوالے کر دیا ڈاکٹر صادق نے رپورٹ لکھی اور اس سے پوچھا۔۔۔۔۔”تمہارا نام کیا ہے؟“

لڑکی نے برقع اوڑھتے ہوئے جواب دیا ”جی میرا نام۔۔۔۔۔میرا نام حنیفہ ہے“

”حنیفہ!“ ڈاکٹر صادق نے اس کا نام پرچی پر لکھا اور اس کو دے دی ”جاؤ، یہ اپنے ڈاکٹر کو دکھا دینا“

لڑکی نے پرچی لی اور قمیض کے اندر اپنی انگیا میں اڑس لی۔

جب وہ باہر نکلی تو میں غیر ارادی طور پر اس کے پیچھے پیچھے تھا لیکن مجھے اس کا پوری طرح احساس تھا کہ ڈاکٹر صادق نے مجھے شک کی نظروں سے دیکھا تھا اسے جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس بات کا یقین تھا کہ اس لڑکی سے میرا تعلق ہے۔ حالانکہ جیسا آپ جانتے ہیں، ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا۔۔۔۔۔سوائے اس کے کہ مجھے اس کی آنکھیں پسند آ گئی تھیں۔

میں اس کے پیچھے پیچھے تھا اس نے اپنے ساتھی لڑکے کی انگلی پکڑی ہوئی تھی جب وہ تانگوں کے اڈے پر پہنچے تو میں نے حنیفہ سے پوچھا ”تمہیں کہاں جانا ہے؟“

اس نے ایک گلی کا نام لیا تو میں نے اس سے جھوٹ موٹ کہا ''مجھے بھی ادھر ہی جانا ہے۔۔۔۔میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں گا''

میں نے جب اس کا ہاتھ پکڑ کر تانگے میں بٹھایا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ میری آنکھیں ایکسریز کا شیشہ بن گئی ہیں۔ مجھے اس کا گوشت پوست دکھائی نہیں دیتا تھا۔۔۔۔صرف ڈھانچہ نظر آتا تھا۔۔۔۔لیکن اس کی آنکھیں۔۔۔۔۔۔۔وہ بالکل ثابت و سالم تھیں، جن میں بے پناہ کشش تھی۔

میرا جی چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ بیٹھوں لیکن یہ سوچ کر کہ کوئی دیکھ لے گا، میں نے اس کے ساتھی لڑکے کو اس کے ساتھ بٹھا دیا اور آپ اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔

تانگہ چلا تو حنیفہ مجھ سے مخاطب ہوئی ''تم کون ہو؟''

''میں۔۔۔۔میں سعادت حسن منٹو ہوں''

''حسن من گو۔۔۔۔۔۔یہ من ٹو کیا ہوا؟''

''کشمیریوں کی ایک ذات ہے''

''ہم بھی کشمیری ہیں''

''اچھا؟''

''ہم کنگ وائس ہیں!''

میں نے مڑ کر اس سے کہا ''یہ تو بہت اونچی ذات ہے''

وہ مسکرائی اور اس کی آنکھیں اور زیادہ پرکشش ہو گئیں

میں نے اپنی زندگی میں بے شمار خوبصورت آنکھیں دیکھی تھیں۔ لیکن وہ

آنکھیں جو حنیفہ کے چہرے پر تھیں، بے حد پر کشش تھیں، معلوم نہیں ان میں کیا چیز تھی جو کشش کا باعث تھی میں اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں کہ وہ قطعاً خوب صورت نہیں تھیں لیکن اس کے باوجود میرے دل میں کھب رہی تھیں۔

میں نے جسارت سے کام لیا اور اس کے بالوں کی ایک لٹ کو جو اس کے ماتھے پر لٹک کر اس کی ایک آنکھ کو ڈھانپ رہی تھی، انگلی سے اٹھایا اور اس کے سر پر چسپاں کر دی۔۔۔اس نے برا نہ مانا۔

میں نے اور جسارت کی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اس پر بھی اس نے کوئی مزاحمت نہ کی اور اپنے ساتھی لڑکے سے مخاطب ہوئی ''تم میرا ہاتھ کیوں دبا رہے ہو؟''

میں نے فوراً اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور لڑکے سے پوچھا ''تمہارا مکان کہاں ہے؟''

لڑکے نے ہاتھ کا اشارہ کیا ''اس بازار میں!''

تانگے نے ادھر کا رخ کیا بازار میں بہت بھیڑ تھی ٹریفک بھی معمول سے زیادہ تانگہ رک رک کے چل رہا تھا سڑک میں چونکہ گڑھے تھے، اس لیے بڑے زور کے دھچکے لگ رہے تھے۔ بار بار اس کا سر میرے کندھوں سے ٹکراتا تھا، اور میرا جی چاہتا تھا کہ اسے اپنے زانو پر رکھ لوں اور اس کی آنکھیں دیکھتا رہوں۔

تھوڑی دیر کے بعد ان کا گھر آ گیا لڑکے نے تانگے والے سے رکنے کے لیے کہا۔ جب تانگہ رکا تو وہ نیچے اترا۔ حنیفہ بیٹھی رہی میں نے اس سے کہا ''تمہارا گھر آ گیا ہے''

حنیفہ نے مڑ کر میری طرف اپنی عجیب وغریب آنکھوں سے دیکھا "بدرو کہاں ہے؟"

میں نے اس سے پوچھا "کون بدرو؟"

"وہ لڑکا جو میرے ساتھ تھا"

میں نے لڑکے کی طرف دیکھا جو تانگے کے پاس ہی تھا "یہ کھڑا تو ہے"

"اچھا۔۔۔۔۔!" یہ کہہ کر اس نے بدرو سے کہا "بدرو! مجھے اتار تو دو"

بدرو نے اس کا ہاتھ پکڑا اور بڑی مشکل سے نیچے اتارا۔ میں سخت متحیر تھا پچھلی نشست پر جاتے ہوئے میں نے اس لڑکے سے پوچھا "کیا بات ہے۔۔۔۔یہ خود نہیں اتر سکتیں؟"

بدرو نے جواب دیا "جی نہیں۔۔۔۔ان کی آنکھیں خراب ہیں۔۔۔۔۔دکھائی نہیں دیتا۔"

☆☆☆☆☆☆

اب اور کہنے کی ضرورت نہیں

یہ دنیا بھی عجیب و غریب ہے۔۔۔۔۔۔خاص کر آج کا زمانہ۔۔۔۔۔۔قانون کو جس طرح فریب دیا جاتا ہے اس کے متعلق شاید آپ کو زیادہ علم نہ ہو۔۔۔۔۔آج کل قانون ایک بے معنی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ادھر کوئی نیا قانون بنتا ہے ادھر یار لوگ اس کا توڑ سوچ لیتے ہیں اس کے علاوہ اپنے بچاؤ کی کئی صورتیں پیدا کر لیتے ہیں۔

کسی اخبار پر کوفت آنی ہو تو آیا کرے اس کا مالک محفوظ و مامون رہے گا۔ اس لیے کہ پرنٹ لائن میں کسی قصائی یا دھوبی کا نام بحیثیت پرنٹر پبلشر اور ایڈیٹر کے درج ہو گا اگر اخبار میں کوئی ایسی تحریر چھپ گئی جس پر گورنمنٹ کو اعتراض ہو تو اصل مالک کے بجائے وہ دھوبی یا قصائی گرفت میں آ جائے گا۔اس کو جرمانہ ہو گا یا قید، جرمانہ تو ظاہر ہے اسے اخبار کا مالک ادا کر دے گا۔مگر قید تو وہ ادا نہیں کر سکتا۔ لیکن ان دو پارٹیوں کے درمیان اس قسم کا معاہدہ ہوتا ہے کہ اگر قید ہوئی تو وہ اس کے گھر اتنے روپے ماہوار پہنچا دیا کرے گا ایسے معاہدہ میں خلاف ورزی بہت کم ہوتی ہے۔

جو لوگ ناجائز طور پر شراب بیچتے ہیں ان کے پاس دو تین آدمی ایسے ضرور موجود ہوتے ہیں جن کا صرف یہ کام ہے کہ اگر پولیس چھاپہ مارے تو وہ گرفتار ہو جائیں اور چند ماہ کی قید کاٹ کر واپس آ جائیں تو اس کا معاوضہ ان کو معقول مل جاتا ہے۔

چھاپہ مارنے والے بھی پہلے ہی سے مطلع کر دیتے ہیں کہ ہم آرہے ہیں۔تم اپنا انتظام کر لو۔۔۔۔چنانچہ فوراً انتظام کر لیا جاتا ہے لیکن مالک غائب ہو جاتا ہے اور وہ کرائے کے آدمی گرفتار ہو جاتے ہیں۔۔۔۔یہ بھی ایک قسم کی ملازمت ہے لیکن دنیا میں جتنی ملازمتیں ہیں کچھ اسی قسم کی ہوتی ہیں۔

میں جب امین پہلوان سے ملا تو وہ تین مہینے کی قید کاٹ کر واپس آیا تھا میں نے اس سے پوچھا ''امین اس دفعہ کیسے جیل میں گئے''

امین مسکرایا ''اپنے کاروبار کے سلسلے میں''

''کیا کاروبار تھا''

''جو رہا ہے وہی ہے''

''بھئی بتاؤ تو۔۔۔۔''

''بتانے کی کیا ضرورت ہے۔۔۔۔۔۔۔آپ اچھی طرح جانتے ہیں مگر خواہ مخواہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔''

میں نے تھوڑے سے توقف کے بعد اس سے کہا۔۔۔''امین تمہیں آئے دن جیل میں جانا کیا پسند ہے''

امین پہلوان مسکرایا'' جناب۔۔۔۔پسند اور ناپسند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔۔لوگ مجھے پہلوان کہتے ہیں حالانکہ میں نے آج تک اکھاڑے کی شکل نہیں دیکھی۔۔۔۔ان پڑھ ہوں۔۔۔۔کوئی اور ہنر بھی مجھے نہیں آتا۔۔۔۔بس جیل جانا آتا ہے وہاں میں خوش رہتا ہوں۔مجھے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔۔۔۔آپ ہر روز دفتر جاتے ہیں کیا وہ جیل نہیں۔''

میں لاجواب ہو گیا "تم ٹھیک کہتے ہو امین! لیکن دفتر جانے والوں کا معاملہ دوسرا ہے۔۔۔۔لوگ انہیں بری نگاہوں سے نہیں دیکھتے"

"کیوں نہیں دیکھتے ضلع کچہری کے نئے منشی اور کلرک ہیں انہیں کون اچھی نظر سے دیکھتا ہے۔۔۔۔رشوتیں لیتے ہیں۔۔۔جھوٹ بولتے ہیں اور پرلے درجے کے مکار ہوتے ہیں مجھ میں ایسا کوئی عیب نہیں۔۔۔۔۔میں اپنی روزی بڑی ایمانداری سے کماتا ہوں۔"

میں نے اس سے پوچھا "کس طرح؟"

اس نے جواب دیا "اس طرح کہ اگر کسی کا کام کرتا ہوں اور قید کاٹتا ہوں جیل میں محنت مشقت کرتا ہوں اور بعد میں اس شخص سے جس کی خاطر میں نے سزا بھگتی تھی۔۔ مجھے دو تین سو روپیہ ملتا ہے تو یہ میرا معاوضہ ہے اس پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔۔۔میں رشوت تو نہیں لیتا۔۔۔حلال کی کمائی ہوں لوگ مجھے غنڈہ سمجھتے ہیں۔۔۔بڑا خطرناک غنڈہ۔۔۔۔۔لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ میں نے آج تک کسی کے تھپڑ بھی نہیں مارا۔ میری لائن بالکل الگ ہے۔"

اس کی لائن واقعی دوسروں سے الگ تھی۔۔۔۔۔۔۔مجھے حیرت تھی کہ تین چار مرتبہ قید کاٹنے کے باوجود اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی وہ بڑا سنجیدہ مگر گنوار قسم کا آدمی تھا جس کو کسی کی پروا نہیں تھی قید کاٹنے کے بعد جب بھی آتا تو اس کا وزن کم از کم دس پاؤنڈ زیادہ ہوتا۔

ایک دن میں نے اس سے پوچھا "امین کیا وہاں کا کھانا تمہیں راس آتا ہے"

اس نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا "کھانا کیسا بھی ہو۔۔۔اس کا

راس کرنا آدمی کا اپنا کام ہے۔۔۔۔۔۔۔ مجھے دال سے نفرت تھی لیکن جب پہلی مرتبہ مجھے وہاں کنکروں بھری دال دی گئی اور ریت ملی روٹی، تو میں نے کہا۔۔۔۔امین یار۔۔۔۔۔یہ سب سے اچھا کھانا ہے، کھا اور خدا کا شکر بجا لا۔ چنانچہ میں ایک دو روز ہی میں عادی ہو گیا۔۔۔ مشقت کرتا کھانا کھاتا اور یوں محسوس ہوتا جیسے میں نے گنجے کے ہوٹل سے پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہے۔"

میں نے ایک دن اس سے پوچھا "تم نے کبھی کسی عورت سے بھی محبت کی ہے"

اس نے اپنے دونوں کان پکڑے۔۔۔۔۔۔ "خدا بچائے اس محبت سے مجھے صرف اپنی ماں سے محبت ہے"

میں نے اس سے پوچھا "تمہاری ماں زندہ ہے"

"جی ہاں۔۔۔۔۔خدا کے فضل و کرم سے۔۔۔۔۔۔بہت بوڑھی ہے لیکن آپ کی دعا سے اس کا سایہ میرے سر پر دیر تک قائم رہے گا اور وہ تو ہر وقت میرے لیے دعائیں مانگتی رہتی ہے کہ خدا مجھے نیکی کی ہدایت کرے۔"

میں نے اس سے کہا "خدا تمہاری ماں کو سلامت رکھے پر میں نے یہ پوچھا تھا کہ تمہیں کسی عورت سے محبت ہوئی ہے یا نہیں دیکھو جھوٹ نہیں بولنا"

امین پہلوان نے بڑے تیز لہجے میں کہا "میں نے اپنی زندگی میں آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا۔۔۔۔۔ میں نے کسی عورت سے محبت نہیں کی"

میں نے پوچھا "کیوں۔۔۔۔۔"

اس نے جواب دیا "اس لیے کہ مجھے اس سے دلچسپی ہی نہیں"

میں خاموش رہا

تیسرے روز اس کی ماں پر فالج گرا اور وہ راہی ملک عدم ہوئی۔ امین پہلوان کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا وہ سوگوار مغموم اور دل شکستہ بیٹھا تھا کہ شہر کے ایک رئیس کی طرف سے اسے بلاوا آیا۔ وہ اپنی عزیز ماں کی میت چھوڑ کر اس کے پاس گیا اور اس سے پوچھا کیوں میاں صاحب آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے۔

میاں صاحب نے کہا ''تمہیں کیوں بلایا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ایک خاص کام ہے''

امین نے جس کے دل و دماغ میں اپنی ماں کا کفن دفن تیر رہا تھا پوچھا

''حضور یہ خاص کام کیا ہے''

میاں صاحب نے سگریٹ سلگایا ''بلیک مارکیٹ کا قصہ ہے مجھے معلوم ہوا ہے کہ آج میرے گودام پر چھاپہ مارا جائے گا سو میں نے سوچا کہ امین پہلوان بہترین آدمی ہے جو اسے نمٹا سکتا ہے۔''

امین نے بڑے مغموم اور زخمی انداز میں کہا'' آپ فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

'' بھئی خدمت و دمت کی بات تم مت کرو۔۔۔۔۔۔بس صرف اتنی سی بات ہے کہ جب چھاپہ پڑے تو گودام کے مالک تم ہو گے۔ گرفتار ہو جاؤ گے زیادہ سے زیادہ جرمانہ پانچ ہزار روپے ہو گا اور ایک دو برس کی قید''

''مجھے کیا ملے گا''

''جب وہاں سے رہا ہو کر آؤ گے تو معاملہ طے کر لیا جائے گا''

امین نے میاں صاحب سے کہا ''حضور یہ دور کی بات ہے جرمانہ تو آپ ادا کر دیں گے لیکن قید تو مجھے کاٹنا پڑے گی آپ با قاعدہ سودا کریں''

میاں صاحب مسکرائے ''تم سے آج تک میں نے کبھی وعدہ خلافی کی ہے۔۔۔۔پچھلی دفعہ میں نے تم سے کام لیا اور تم کو تین مہینے کی قید ہوئی تو کیا میں نے جیل خانے میں ہر قسم کی سہولت بہم نہ پہنچائی تم نے باہر آ کر مجھ سے کہا کہ تمہیں وہاں کوئی تکلیف نہیں تھی۔۔۔۔اگر تم کچھ عرصے کے لیے جیل چلے گئے تو وہاں تمہیں ہر آسائش ہو گی۔''

امین نے کہا ''جی۔۔۔۔یہ سب درست ہے۔۔۔۔لیکن۔۔۔۔''

''لیکن۔۔۔۔۔کیا؟''

امین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ''میاں صاحب۔۔۔۔۔میری ماں مر گئی ہے۔''

''کب''

''آج صبح''

میاں صاحب نے افسوس کا اظہار کیا ''کفنا دفنا دیا ہو گا''

امین کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرتے گئے ''میاں صاحب! ابھی کچھ بھی نہیں ہو سکا۔۔۔۔میرے پاس تو اپنے کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں ہے۔''

میاں صاحب نے چند لمحات حالات پر غور کیا اور امین سے کہا ''تو ایسا کرو۔۔۔۔میرا مطلب ہے کہ تجہیز و تکفین کا بندوبست میں ابھی کیے دیتا ہوں۔۔۔۔تمہیں کسی قسم کا تردد نہیں کرنا چاہیے۔۔۔۔۔تم گودام پر جاؤ اور

اپنی ڈیوٹی سنبھالو"

امین نے اپنی میلی قمیص کی آستین سے آنسو پونچھے" لیکن میاں صاحب میں۔۔۔۔۔میں اپنی ماں کے جنازے کو کندھا بھی نہ دوں"

میاں صاحب نے فلسفیانہ انداز میں کہا" یہ سب رسمی چیزیں ہیں مرحومہ کو دفنانا ہے سو یہ کام بڑی اچھی طرح سے ہو جائے گا تمہیں جنازے کے ساتھ جانے کی کیا ضرورت ہے تمہارے ساتھ جانے سے مرحومہ کو کیا راحت پہنچے گی۔۔۔۔وہ تو بے چاری اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے۔۔۔اس کے جنازے کے ساتھ کوئی بھی جائے۔۔۔۔۔کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔۔۔۔اصل میں تم لوگ جاہل ہو۔۔۔۔۔میں اگر مر جاؤں تو مجھے کیا معلوم ہے کہ میرے جنازے میں کس کس عزیز اور دوست نے شرکت کی تھی۔ مجھے اگر جلا بھی دیا جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میری لاش کو چیلوں اور گدھوں کے حوالے کر دیا جائے تو مجھے اس کی کیا خبر ہو گی۔ تم زیادہ جذباتی نہ بنو دنیا میں سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ اپنی ذات کے متعلق سوچا جائے۔۔۔۔میں پوچھتا ہوں تمہاری کمائی کے ذرائع کیا ہیں۔"

امین سوچنے لگا چند لمحات اپنی بساط کے مطابق غور کرنے کے بعد اس نے جواب دیا" حضور میری کمائی کے ذرائع آپ کو معلوم ہیں مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں"

"میں نے اس لیے پوچھا تھا کہ تمہیں میرا کام کرنے میں کیا حیل وحجت ہے میں تمہاری ماں کی تجہیز و تکفین کا ابھی بندوبست کیے دیتا ہوں اور جب تم جیل سے

واپس آؤ گے تو''

امین پہلوان نے بڑے بینڈے انداز میں پوچھا ''تو آپ میرا ابھی بندوبست کر دیں گے''

میاں صاحب بوکھلائے ''تم کیسی باتیں کرتے ہو امین پہلوان''

امین پہلوان نے ذرا درشت لہجے میں کہا ''امین پہلوان کی ایسی کی تیسی آپ یہ بتایئے کہ مجھے کتنے روپے ملیں گے۔۔۔۔میں ایک ہزار سے کم نہیں لوں گا''

''ایک ہزار تو بہت زیادہ ہیں''

امین نے کہا ''زیادہ ہے یا کم۔۔۔۔میں کچھ نہیں جانتا۔۔۔۔۔۔۔میں جب قید کاٹ کر آؤں گا تو اپنی ماں کی قبر پختہ بناؤں گا سنگ مرمر کی۔۔۔۔۔۔وہ مجھ سے بہت پیار کرتی ہے۔''

میاں صاحب نے اس سے کہا ''اچھا بھئی ایک ہزار ہی لے لینا''

امین نے میاں صاحب سے کہا ''تو لائیے اتنے روپے دیجئے کہ میں کفن دفن کا انتظام کر لوں۔۔۔۔۔اس کے بعد میں آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہو جاؤں گا۔''

میاں صاحب نے اپنی جیب سے بٹوہ نکالا۔۔۔۔۔''لیکن تمہارا کیا بھروسہ ہے''

امین کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کو کسی نے ماں بہن کی گالی دی ہے ''میاں صاحب آپ مجھے بے ایمان سمجھتے ہیں۔۔۔۔بے ایمان آپ ہیں۔۔۔۔اس لیے کہ اپنے فعلوں کا بوجھ میرے سر پر ڈال رہے ہیں''

میاں صاحب موقع شناس تھے انہوں نے سمجھا کہ امین بگڑ گیا ہے چنانچہ اس نے فوراً اسے اپنی چرب زبانی سے رام کرنے کی کوشش کی لیکن امین پر کوئی اثر نہ ہوا۔

جب وہ گھر پہنچا تو دیکھا کہ غسال اس کی ماں کو آخری غسل دے چکے ہیں۔ کفن بھی پہنچایا جا چکا ہے امین بہت متحیر ہوا کہ اس پر یہ مہربانی کس نے کی ہے۔۔۔میاں صاحب نے۔۔۔۔لیکن وہ تو سودا کرنا چاہتے تھے۔

اس نے ایک آدمی سے جو تابوت کو سجانے کے لیے پھول گوندھ رہا تھا پوچھا ''یہ کس آدمی نے اہتمام کیا ہے''

پھول والے نے جواب دیا ''حضور آپ کی بیوی نے''

امین چکرا گیا۔۔۔۔وہ اپنے شدید تعجب کا مظاہرہ کرتا مگر خاموش رہا پھول والے سے صرف اتنا پوچھا۔۔۔۔۔۔''کہاں ہیں وہ۔۔۔''

پھول والے نے جواب دیا'' جی اندر ہیں۔۔۔۔۔۔۔آپ کا انتظار کر رہی تھیں''

امین اندر گیا تو دیکھا کہ ایک نوجوان، خوبصورت لڑکی اس کی چارپائی پر بیٹھی ہے۔۔۔۔امین نے اس سے پوچھا'' آپ کون ہیں۔۔۔۔یہاں کیوں آئی ہیں''

اس لڑکی نے جواب دیا''میں آپ کی بیوی ہوں یہاں کیوں آئی ہوں یہ آپ کا عجیب وغریب سوال ہے''

امین نے اس سے پوچھا''میری بیوی تو کوئی بھی نہیں بتاؤ تم کون ہو؟''

لڑکی مسکرائی

”میں۔۔۔۔۔میاں۔۔۔۔دین کی بیٹی ہوں۔۔۔۔ان سے جو آپ کی
گفتگو ہوئی میں نے سب سنی۔۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔“

امین نے کہا

”اور اب کہنے کی ضرورت نہیں“

☆☆☆☆☆☆



اس کا پتی

لوگ کہتے تھے کہ نھو کا سر اس لیے گنجا ہوا ہے کہ وہ ہر وقت سوچتا رہتا ہے اس بیان میں کافی صداقت تھی کیونکہ سوچتے وقت نھو ہمیشہ سر کھجلایا کرتا ہے کیونکہ اس کے بال بہت کھردرے اور خشک ہیں اور تیل نہ ملنے کے باعث بہت خستہ ہو گئے ہیں۔ اس لیے بار بار کھجلانے سے اس کے سر کا درمیانی حصہ بالوں سے بالکل بے نیاز ہو گیا ہے۔ اگر اس کا سر ہر روز دھویا جاتا تو یہ حصہ ضرور چمکتا مگر میل کی زیادتی کی وجہ سے اس کی حالت بالکل اس توے کی سی ہو گئی ہے جس پر ہر روز روٹیاں پکائی جائیں مگر اسے صاف نہ کیا جائے۔

نھو بھٹے پر اینٹیں بنانے کا کام کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ اکثر اپنے خیالات کو کچی اینٹیں سمجھتا تھا اور کسی پر فوراً ہی ظاہر نہیں کرتا تھا اس کا یہ اصول تھا کہ خیال کو اچھی طرح پکا کر باہر نکالنا چاہیے تھا تاکہ جس عمارت میں بھی وہ استعمال ہو اس کا ایک مضبوط حصہ بن جائے۔

گاؤں والے اس کے خیالات کی قدر کرتے تھے اور ہر بات میں اس سے مشورہ لیا کرتے تھے لیکن اس قدر افزائی سے نھو اپنے آپ کو اہم نہیں سمجھنے لگا تھا جس طرح گاؤں میں شمبھو کا کام ہر وقت لڑتے جھگڑتے رہتا تھا۔ اسی طرح اس کا کام ہر وقت دوسروں کو مشورہ دیتے رہنا تھا وہ سمجھتا تھا کہ ہر شخص صرف ایک کام کے لیے پیدا ہوتا ہے چنانچہ شمبھو کے بارے میں چوپال پر جب کبھی ذکر چھڑتا تو وہ ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا کھاد کتنی بدبودار چیز ہے پر کھیتی باڑی اس کے بنا سوہی

نہیں سکتی شمبھو کے ہر سانس میں گالیوں کی باس آتی ہے ٹھیک ہے پر گاؤں کی چہل پہل اور رونق بھی اسی کے دم سے قائم ہے اگر وہ نہ ہو تو لوگوں کو کیسے معلوم ہوگا کہ گالیاں کیا ہوتی ہیں، اچھے بول جاننے کے ساتھ ساتھ برے بول بھی معلوم ہونے چاہئیں۔

نتھو بھٹے سے واپس آرہا تھا اور حسب معمول سر کھجاتا گاؤں کے کسی مسئلے پر غور وفکر کر رہا تھا لالٹین کے کھمبے کے پاس پہنچ کر اس نے اپنا ہاتھ سر سے علیحدہ کیا۔ جس کی انگلیوں سے وہ بالوں کا ایک میل بھرا گچھا مروڑ رہا تھا وہ اپنے جھونپڑے کے تازہ لپے ہوئے چبوترے کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ سامنے سے اسے کسی نے آواز دی۔

نتھو پلٹا اور اپنے سامنے والے جھونپڑے کی طرف بڑھا جہاں سے مادھو اسے اب ہاتھ کے اشارے سے بلا رہا تھا۔

جھونپڑے کے چھجے کے نیچے چبوترے پر مادھو، اس کا لنگڑا بھائی اور چودھری بیٹھے تھے ان کے انداز نشست سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نہایت ہی اہم بات سوچ رہے ہیں سب کے چہرے کچی اینٹوں کی مانند پیلے تھے مادھو تو بہت دنوں کا بیمار دکھائی دیتا تھا ایک کونے میں طاقچے کے نیچے روپا کی ماں بیٹھی تھی غلیظ کپڑوں میں وہ میلے کپڑوں کی ایک گٹھڑی دکھائی دے رہی تھی۔

نتھو نے دور ہی سے معاملے کی نزاکت محسوس کی اور قدم تیز کر کے ان کے پاس پہنچ گیا۔

مادھو نے اشارے سے اس کو پاس بیٹھنے کو کہا نتھو بیٹھ گیا اور اس کا ایک ہاتھ

غیر ارادی طور پر اپنے بالوں کے اس گچھے کی طرف بڑھ گیا جس کی جڑیں کافی ہل چکی تھیں اب وہ ان لوگوں کی باتیں سننے کے لیے بالکل تیار تھا۔

مادھو اس کو اپنے پاس بٹھا کر خاموش ہو گیا۔ مگر اس کے کپکپاتے ہونٹ صاف ظاہر کر رہے تھے کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن فوراً نہیں کہہ سکتا۔ مادھو کا لنگڑا بھائی بھی خاموش تھا اور بار بار اپنی کٹی ہوئی ٹانگ کے آخری ٹنڈ منڈ حصے پر جو گوشت کا ایک بدشکل لوتھڑا سا بنا ہوا تھا، ہاتھ پھیر رہا تھا، روپا کی ماں طاقچے میں رکھی ہوئی مورتی کی مانند گونگی بنی ہوئی تھی اور چودھری اپنی مونچھوں کو تاؤ دینا بھول کر زمین پر لکیریں بنا رہا تھا۔

نتھو نے خود ہی بات شروع کی "تو۔۔۔۔۔۔"

مادھو بولا "نتھو بات یہ ہے کہ۔۔۔۔۔بات یہ ہے کہ۔۔۔۔اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ بات کیا ہے میں کچھ کہنے کے قابل نہ رہا۔۔۔۔چودھری! تم ہی جی کڑا کر کے سارا قصہ سنا دو۔"

نتھو نے گردن اٹھا کر چودھری کی طرف دیکھا مگر وہ کچھ نہ بولا اور زمین پر لکیریں بناتا رہا۔

دوپہر کی اداس فضا بالکل خاموش تھی، البتہ کبھی کبھی چیلوں کی چیخیں سنائی دیتی تھیں اور جھونپڑے کے داہنے ہاتھ گھورے پر جو مرغ کوڑے کو کرید رہا تھا۔ کبھی کبھی کسی مرغ کو دیکھ کر بول اٹھتا۔

چند لمحوں تک جھونپڑے کے چھجے کے نیچے سب خاموش رہے اور نتھو معاملے کی نزاکت اچھی طرح سمجھ گیا۔

روپا کی ماں نے روتی آواز میں کہا "میرے پھوٹے بھاگ!۔۔۔۔۔اس کو تو جو کچھ اجڑنا تھا اجڑی، مجھ ابھاگن کی ساری دنیا برباد ہوگئی۔۔۔۔۔کیا اب کچھ نہیں ہوسکتا؟"

مادھو نے کندھے ہلائے اور نھو سے مخاطب ہو کر کہا "کیا ہوسکتا ہے؟ بھئی میں یہ کلنک کا ٹیکا اپنے ماتھے پر لگانا نہیں چاہتا۔۔۔۔میں نے جب اپنے لالو کی بات روپا سے پکی کی تھی تو مجھے یہ قصہ معلوم نہیں تھا۔۔۔۔۔اب تم لوگ خود ہی وچار کرو کہ سب کچھ جانتے ہوئے میں اپنے بیٹے کا بیاہ روپا سے کیسے کر سکتا ہوں؟"

یہ سن کر نھو کی گردن اٹھی، وہ شاید یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ لالو کا بیاہ روپا سے کیوں نہیں ہوسکتا ابھی کل تک سب ٹھیک ٹھاک تھا اب اتنی جلدی کیا ہوگیا کہ روپا لالو کے قابل نہیں رہی۔ وہ روپا اور لالو دونوں کو اچھی طرح جانتا تھا اور سچ پوچھو تو گاؤں میں ہر شخص ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتا ہے وہ کون سی بات تھی جو اسے ان دونوں کے بارے میں معلوم نہ تھی روپا اس کے سامنے پھولی پھلی، بڑھی اور جوان ہوئی۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ اس کے گال پر ایک زور کا دھپا بھی مارا تھا اور اس کو اتنی مجال نہ ہوئی تھی کہ چوں بھی کرے حالانکہ گاؤں کی سب چھوکریاں چھوکرے گستاخ تھے اور بڑوں کا بالکل ادب نہ کرتے تھے روپا تو بڑی بھولی بھالی لڑکی تھی۔ باتیں بھی بہت کم کرتی تھی اور اس کے چہرے پر کوئی ایسی علامت نہ تھی جس سے یہ پتہ چلتا کہ وہ کوئی شرارت بھی کر سکتی ہے پھر آج اس کی بابت یہ باتیں کیوں ہو رہی تھیں۔

نھو کو گاؤں کے ہر جھونپڑے اور اس کے اندر رہنے والوں کا حال معلوم تھا

مثال کے طور پر اسے معلوم تھا کہ چودھری کی گائے نے صبح سویرے ایک بچھڑا دیا ہے اور مادھو کے لنگڑے بھائی کی بیساکھی ٹوٹ گئی۔ گاما حلوائی اپنی مونچھوں کے بال چنوا رہا تھا کہ اس کے ہاتھ سے آئینہ گر کر ٹوٹ گیا اور ایک سیر دودھ کے پیسے نائی کو بطور قیمت دینا پڑے۔۔۔۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ دو اپلوں پر پرسرام اور گنگو کی چخ پخ ہوتے ہوتے رہ گئی تھی اور سالگ رام نے اپنے بچوں کو پاپڑ بھون کر کھلائے تھے حالانکہ وید جی نے منع کیا تھا کہ ان کو مرچوں والی کوئی شے نہ دی جائے۔۔۔۔ نتھو حیران تھا کہ ایسی کون سی بات جو اسے معلوم نہیں تمام خیالات اس کے دماغ میں ایک دم آئے اور وہ مادھو کاکا سے اپنی حیرت دور کرنے کی خاطر سے کوئی سوال کرنے ہی والا تھا کہ چودھری نے زمین پر طوطے کی شکل کرتے ہوئے کہا" کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ بچے کی ماں بن جائے گی"

تو یہ بات تھی کہ نتھو کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ دوپہر کی دھوپ میں اڑنے والی ساری چیلیں اس کے دماغ میں گھس کر چیخنے لگی ہیں اس نے اپنے بال زیادہ تیزی سے مروڑنے شروع کر دیئے۔

مادھو کاکا نتھو کی طرف جھکا اور بڑے دکھ بھرے لہجے میں اس سے کہنے لگا" بیٹا! تمہیں یہ تو معلوم ہے کہ میں نے اپنے بیٹے کی بات روپا سے پکی کی تھی اب میں تم سے کیا کہوں۔۔۔ ذرا کان لاؤ ادھر" اس نے ہولے سے نتھو کے کان میں کچھ کہا اور پھر اسی لہجے میں کہنے لگا" کتنی شرم کی بات ہے میں تو کہیں کا نہ رہا، یہ میرا بڑھاپا اور یہ جان لیوا دکھ اور تو اور لالو کو بتاؤں کیا دکھ ہوا ہوگا۔۔۔ تمہیں

انصاف کرو کیا لالو کی شادی اب اس سے ہو سکتی ہے۔۔۔ لالو کی شادی تو ایک طرف رہی، کیا ایسی لڑکی ہمارے گاؤں میں رہ سکتی ہے۔۔۔ کیا اس کے لیے ہمارے یہاں کوئی جگہ ہے؟''

نھتو نے سارے گاؤں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور اسے ایسی کوئی جگہ نظر نہ آئی جہاں روپا اپنے والد سمیت رہ سکتی تھی۔ البتہ اس کا ایک جھونپڑا تھا۔ جس میں وہ چاہے کسی کو بھی رکھتا پچھلے برس اس نے کوڑھی کو اس میں پناہ دی تھی حالانکہ سارا گاؤں اسے روک رہا تھا اور اسے ڈرا رہا تھا کہ دیکھو نھتو یہ بیماری بڑی چھوت والی ہوتی ہے ایسا نہ ہو کہ کہیں تمہیں چمٹ جائے لیکن وہ اپنی مرضی کا مالک تھا اس نے وہی کچھ کیا جو اس کے من نے اچھا سمجھا کوڑھی اس کے گھر میں پورے چھ مہینے رہ کر مر گئی لیکن اسے بیماری ویماری بالکل نہ لگی اگر گاؤں میں روپا کے لیے کوئی جگہ نہ رہے تو کیا اس کا یہ مطلب تھا کہ اسے ماری ماری پھرنے دیا جائے۔ ہرگز نہیں، نھتو اس بات کا قائل نہ تھا کہ دکھی پر اور دکھ لاد دیئے جائیں اس کے جھونپڑے میں ہر وقت اس کے لیے جگہ تھی۔

وہ چھ مہینے تک اس کوڑھی کی تیمار داری کر سکتا تھا اور روپا کوڑھی تو نہیں تھی۔۔۔۔۔۔ کوڑھی تو نہیں تھی، یہ سوچتے ہوئے نھتو کا دماغ ایک گہری بات سوچنے لگا۔۔۔۔۔ روپا کوڑھی نہیں تھی، اس لیے وہ ہمدردی کی زیادہ مستحق بھی نہ تھی۔ اسے کیا روگ تھا؟۔۔۔ کچھ بھی نہیں، جیسا کہ یہ لوگ کہہ رہے تھے، وہ تھوڑے ہی دنوں بچے کی ماں بننے والی تھی، پر یہ بھی کوئی روگ ہے اور کیا ماں بننا کوئی پاپ ہے؟ لڑکی عورت بننا چاہتی ہے اور عورت ماں، اس کی اپنی استری ماں

بننے کے لیے تڑپ رہی تھی اور وہ خود یہ چاہتا تھا کہ وہ جلدی ماں بن جائے، اس لحاظ سے بھی روپا کا ماں بننا کوئی جرم نہ تھا۔ جس پر اسے سزا دی جائے یا پھر اس رحم کا مستحق قرار دیا جائے وہ ایک کی بجائے دو بچے جنے۔ اس سے کسی کا کیا بگڑتا تھا وہ عورت ہی تو تھی مندر میں گڑی ہوئی دیوی تو تھی نہیں، اور پھر یہ لوگ خواہ مخواہ کیوں اپنی جان ہلکان کر رہے تھے مادھو کاکا کے لڑکے سے اس کی شادی ہوتی تو بھی کبھی نہ کبھی بچہ ضرور پیدا ہوتا۔ اب کون سی آفت آ گئی تھی یہ بچہ اب جو اس کے پیٹ میں تھا کہیں سے اڑ کر تو آ نہیں گیا تھا شادی بیاہ ضرور ہوا ہوگا، یہ لوگ باہر بیٹھے آپ ہی فیصلے کر رہے ہیں اور جس کی بابت فیصلہ ہو رہا ہے اس سے کچھ پوچھتے ہی نہیں، گویا بچہ وہ نہیں بلکہ یہ خود جن رہے ہیں عجیب بات تھی، اور پھر ان کو بچے کی کیا فکر پڑ گئی تھی، بچے کی فکر یا تو ماں کرتی ہے یا اس کا باپ ـــ باپ؟ ـــــــ اور مزہ دیکھئے کہ کوئی بچے کے باپ کی بات ہی نہیں کرتا تھا۔

یہ سوچتے ہوئے نتھو کے دماغ میں ایک بات آئی اور اس نے مادھو کاکا سے کہا ''کاکا! جو کچھ تم نے کہا ہے اس سے مجھے بڑا دکھ ہوا پر تم نے یہ کیسے کہہ دیا کہ روپا کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ـــــ ہم سب اپنے اپنے جھونپڑوں کو تالے لگا دیں تو بھی اس کے لیے ایک دروازہ کھلا رہتا ہے۔''

چودھری نے زمین پر طوطے کی آنکھ بناتے ہوئے کہا ''توبہ کا!''

نتھو نے جواب دیا ''ان کے لیے جو پاپی ہوں ـــــــ روپا نے کوئی پاپ نہیں کیا۔ وہ نردوش ہے۔''

چودھری نے حیرت سے مادھو کاکا کی طرف دیکھا اور کہا ''اس نے پوری بات نہیں سنی۔''

مادھو کا لنگڑا بھائی اپنی کٹی ہوئی ٹانگ پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

نتھو روپا کی ماں سے مخاطب ہوا ''ابھی سن لیتا ہوں۔۔۔۔۔۔روپا کہاں ہے؟''

روپا کی ماں نے اپنی کھردری انگلیوں سے آنسو پونچھے اور کہا ''اندر بیٹھی اپنے نصیبوں کو رو رہی ہے۔''

یہ سن کر نتھو نے اپنا سر ایک بازو سے کھجایا اور اٹھ کر جھونپڑے کے اندر چلا گیا۔

روپا اندھیری کوٹھری کے ایک کونے میں سر جھکائے بیٹھی تھی اس کے بال بکھرے ہوئے تھے میلے کچیلے کپڑوں میں اندھیرے کے اندر وہ گیلی مٹی کا ایک ڈھیر سا دکھائی دے رہی تھی جو باتیں باہر ہو رہی تھیں ان کا ایک ایک لفظ اس نے سنا تھا۔ حالانکہ اس کے کان اس کے اپنے دل کی باتیں سننے میں لگے ہوئے تھے جو کسی طرح ختم ہی نہ ہوتی تھیں۔ نتھو اندر آنے کے لیے اٹھا تو وہ دوڑ کر سامنے کھٹیا پڑ جا پڑی اور گدڑی میں اپنا سر منہ چھپا لیا۔

نتھو نے جب دیکھا کہ روپا چھپ گئی ہے تو اسے بڑی حیرت ہوئی اس نے پوچھا ''ارے مجھ سے کیوں چھپتی ہو؟''

روپا رونے لگی اور اپنے آپ کو اور کپڑے میں لپیٹ لیا۔ وہ بغیر آواز کے رو رہی تھی مگر نتھو کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ روپا کے آنسو اس کے تپتے ہوئے دل پر گر

رہے ہیں اس نے گدڑی کے اس حصہ پر ہاتھ پھیرا جس کے نیچے روپا کا سر تھا اور کہا "تم مجھ سے کیوں چھپتی ہو؟"

روپا نے سسکیوں سے جواب دیا "روپا نہیں چھپتی نتھو ۔۔۔۔۔۔ وہ اپنے پاپ کو چھپا رہی ہے۔"

نتھو اس کے پاس بیٹھ گیا اور کہنے لگا "کیسا پاپ ۔۔۔۔۔ تم نے کوئی پاپ نہیں کیا ۔۔۔ اور اگر کیا بھی ہو تو اسے چھپانا چاہیے، یہ تو خود ایک پاپ ہے ۔۔۔۔ میں تم سے صرف ایک بات پوچھنے آیا ہوں مجھے یہ بتا دو کہ کس نے تمہاری ہنستی آنکھوں میں آنسو بھر دیئے ہیں کس نے اس بالی عمر میں تمہیں پاپ اور پن کے جھگڑے میں پھنسا دیا ہے"

"میں کیا کہوں؟" روپا یہ کہہ کر گدڑی میں اور سمٹ گئی نتھو بولتا تھا اور روپا کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی اسے اکٹھا کر رہا ہے اسے سکیڑ رہا ہے۔

نتھو نے بڑی مشکل سے روپا کے منہ سے کپڑا ہٹایا اور اسے اٹھا کر بٹھا دیا روپا نے دونوں ہاتھوں سے اپنے منہ کو چھپا لیا اور زور زور سے رونا شروع کر دیا اس سے نتھو کو بہت دکھ ہوا ایک تو پہلے اسے یہ چیز ستا رہی تھی کہ ساری بات اس کے ذہن میں مکمل طور پر نہیں آتی اور دوسرے روپا اس کے سامنے رو رہی تھی۔ اگر اسے ساری بات معلوم ہوتی تو وہ اس کے یہ سارے آنسو روکنے کی کوشش کر سکتا تھا جو میلی گدڑی میں جذب ہو رہے تھے مگر اس کو سوائے اس کے اور کچھ معلوم نہ تھا کہ روپا تھوڑے ہی دنوں میں بچے کی ماں بننے والی ہے۔

اس نے پھر اس سے کہا "روما تم مجھے بتاتی کیوں نہیں ہو ۔۔۔۔۔۔ نتھو بھیا

تم سے پوچھ رہا ہے اور وہ کوئی غیر تھوڑی ہے، جو تم یوں اپنے من کو چھپا رہی ہو۔۔۔تم روتی کیوں ہو غلطی ہو ہی جایا کرتی ہے۔۔۔۔۔۔لالو کی کسی اور سے شادی ہو جائے گی اور تم اپنی جگہ خوش رہو گی۔۔۔تمہیں دنیا کا ڈر ہے تو میں کہوں گا کہ تم بالکل بیوقوف ہو، لوگوں کے جو جی میں آئے کہیں، تمہیں اس سے کیا۔۔۔۔۔۔غلطی کر کے اپنے آپ کو دوسروں کے حوالے کر دینا تو میری سمجھ میں سب سے بڑی غلطی ہے۔۔۔۔۔جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ اب تو ہمیں یہ سوچنا ہے کہ اس کے آگے کیا ہو گا۔۔۔۔۔۔تم دوسروں کی بابت نہ سوچو، اپنی فکر کرو، سب سے زیادہ ضروری چیز اس وقت تم ہو اور سچ پوچھو تو اپنی ذات ہی ہمیشہ سب سے ضروری ہوتی ہے۔۔۔۔۔رونے دھونے سے کچھ نہ ہو گا روپا، آنسو بھری آنکھوں سے نہ تم مجھے ہی ٹھیک طور سے دیکھ سکتی ہو اور اپنے آپ کو۔۔۔۔رونا بند کرو اور مجھے ساری بات بتاؤ۔"

روپا کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اس سے کیا کہے، وہ دل میں سوچتی تھی کہ اب ایسی کون سی بات رہ گئی ہے جو دنیا کو معلوم نہیں یہی سوچتے ہوئے اس نے نتھو سے کہا "نتھو بھیا! مجھ سے زیادہ تو دوسروں کو معلوم ہے میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ جو کچھ میں سوچتی تھی ایک سپنا تھا، یوں تو ہر چیز سپنا ہوتی تھی، پر یہ سپنا بڑا ہی عجیب ہے کیسے شروع ہوا کیونکر ختم ہوا۔ اس کا کچھ پتا ہی نہیں چلتا۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام دن جو میں کبھی خوشی سے گزارتی تھی آنکھوں میں آنسو بننا شروع ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔میں گھڑا لے کر اچھلتی، کودتی، گاتی کنوئیں پر پانی بھرنے گئی پانی بھر کر جب واپس آنے لگی تو ٹھوکر لگی اور گھڑا چکنا چور ہو گیا، مجھے بڑا دکھ ہوا، میں

نے چاہا کہ اس ٹوٹے ہوئے گھڑے کے ٹکڑے اٹھا کر جھولی میں بھر لوں پر لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا نقصان میرا ہوا، چاہیے تو یہ تھا کہ وہ مجھ سے ہمدردی کرتے، پر انہوں نے الٹا مجھے ہی ڈانٹنا شروع کر دیا۔ گویا گھڑا ان کا تھا اور توڑنے والی میں تھی اور اس روڑے کا کوئی قصور ہی نہ تھا جو راستے میں پڑا تھا اور جس سے دوسرے بھی ٹھوکر کھا سکتے تھے۔۔۔۔۔۔ تم مجھ سے کچھ نہ پوچھو، مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔‘‘

نھو کی انگلیاں زیادہ تیزی سے بالوں کا گچھا مروڑنے لگیں اس نے بڑے اضطراب سے کہا ’’میں صرف اتنا پوچھتا ہوں کہ وہ ہے کون؟‘‘

’’کون؟‘‘

’’وہی۔۔۔۔۔۔۔ وہی۔۔‘‘ نھو اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا

روپا کے سینے سے بے اختیار ایک آہ نکل گئی ’’وہ پہلے جتنا نزدیک اب اتنا ہی دور ہے۔‘‘

’’میں اس کا نام پوچھتا ہوں۔۔۔۔۔ اور جانتی ہو میں تم سے اس کا نام کیوں پوچھتا ہوں؟۔۔۔۔۔۔ اس لیے کہ وہ تمہارا پتی ہے۔۔۔۔۔۔ اور تم اس کی پتنی ہو۔۔۔۔۔ تم اس کی ہو اور وہ تمہارا۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔‘‘

نھو اس کے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ روپا نے دیوانہ وار اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور پھٹے ہوئے لہجہ میں کہا ’’ہولے ہولے بولو نھو ہولے ہولے بولو، کہیں وہ۔۔۔۔ جو میرے ہردے میں نیا جیو ہے نہ سن لے کہ اس کی ماں پاپن ہے۔۔۔۔ نھو اسی ڈر کے مارے تو میں سوچتی نہیں زیادہ غم نہیں کرتی کہ اس کو

کچھ معلوم نہ ہو۔۔۔۔۔۔ پر بیٹھے بیٹھے کبھی میرے من میں آتا ہے کہ میں ڈوب مروں اپنا گلا گھونٹ لوں، یا زہر کھا کے مر جاؤں۔''

نھتو نے اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا وہ سوچ رہا تھا ایک دو سیکنڈ غور کرنے کے بعد اس نے کہا ''کبھی نہیں۔۔۔۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا، تم کیوں مرو۔ یوں تو موت سے چھٹکارا نہیں، سب کو ایک دن مرنا ہے پر اسی لیے تو جینا بھی ضروری ہے۔۔۔۔ میں پڑھا لکھا پڑھا نہیں، میں کوئی پنڈت نہیں، پر جو کچھ میں نے کہا ہے ٹھیک ہے تم مجھے اس کا نام بتا دو۔ میں تمہیں اس کے پاس لے چلوں گا اور اسے مجبور کروں گا کہ وہ تمہارے ساتھ بیاہ کر لے اور تمہیں اپنے پاس رکھے۔۔۔۔۔۔ وہی تمہارا پتی ہے''

نھتو پھر روپا کے پاس بیٹھ گیا اور کہنے لگا ''لو میرے کان میں کہہ دو ۔۔۔۔۔ وہ کون ہے؟۔۔۔۔۔۔ روپا کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں، کیا تمہیں یقین نہیں آتا کہ میں تمہارے لیے کچھ کر سکوں گا''

روپا نے جواب دیا ''تم میرے لیے سب کچھ کر سکتے ہو نھتو! پر جس آدمی کے پاس تم مجھے لے جانا چاہتے ہو کیا وہ بھی کچھ کرے گا؟۔۔۔۔۔۔ وہ تو مجھے بھول ہی چکا ہوگا''

نھتو نے کہا ''تمہیں دیکھتے ہی اسے سب کچھ یاد آ جائے گا۔۔۔۔۔ باقی چیزوں کی یاد اسے میں دلاؤں گا۔۔۔۔۔۔ تم مجھے اس کا نام تو بتاؤ۔۔۔۔۔۔ یہ ٹھیک ہے کہ استری اپنے پتی کا نام نہیں لیتی، پر ایسے موقع پر تمہیں کوئی لاج نہ آنی چاہیے۔''

روپا خاموش رہی، اس پر نتھو اور زیادہ مضطرب ہو گیا ''میں تمہیں ایک سیدھی بات سمجھاتا ہوں اور تم سمجھتی ہی نہیں ہو، پگلی! جو تمہارے بچے کا باپ ہے وہی تمہارا پتی ہے۔۔۔اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں تم بس آنسو بہائے جاتی ہو، کچھ سنتی ہی نہیں ہو۔۔۔۔میں پوچھتا ہوں اس کا نام بتانے میں ہرج ہی کیا ہے۔۔۔۔لو، تم نے تو اور رونا شروع کر دیا ہے اچھا بھئی ہیں زیادہ باتیں نہیں کرتا، تم یہ بتاؤ کہ وہ ہے کون۔۔۔۔تم مان لو میں اس کا کان پکڑ کر سیدھے راستے پر لے آؤں گا۔''

روپا نے سسکیوں میں کہا ''تم بار بار پتی نہ کہو نتھو۔۔۔۔میری جوانی، میری آشا، میری دنیا، کبھی کی ودھوا ہو چکی ہے۔۔۔۔تم میری مانگ میں سیندور بھرنا چاہتے ہو اور میں چاہتی ہوں کہ سارے بال ہی نوچ ڈالوں۔۔۔۔۔نتھو اب کچھ نہیں ہو سکے گا۔۔۔میری جھولی کے بیر زمین پر گر کر۔۔۔۔سب کے سب موری میں جا پڑے ہیں۔ اب انہیں باہر نکالنے سے کیا فائدہ۔۔۔۔اس کا نام پوچھ کر تم کیا کرو گے۔۔۔لوگ تو اب میرا نام بھول جانا چاہتے ہیں۔''

نتھو تنگ آ گیا اور تیز لہجے میں کہنے لگا '' تم۔۔۔۔۔تم بیوقوف ہو۔۔۔۔میں اب تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا''

وہ اٹھ کر جانے لگا تو روپا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا ایسا کرتے ہوئے اس کا رنگ بالکل زرد پڑ گیا۔

نتھو نے اس کی گیلی آنکھوں کی طرف دیکھا ''بولو؟''

روپا بولی ''نتھو بھیا! مجھے مارو مجھے خوب پیٹو، شاید میں اس طرح اس کا نام بتا

دوں۔۔۔۔تمہیں یاد ہوگا ایک بار میں نے بچپن میں مندر کے ایک پیڑ سے کچے آم توڑے تھے اور تم نے ایک ہی چانٹا مار کر مجھ سے سچی بات کہلوا لی تھی۔۔۔۔آؤ مجھے مارو یہ چور جسے میں نے اپنے من میں پناہ دے رکھی ہے بغیر مار کے باہر نہیں نکلے گا۔''

نتھو خاموش رہا۔ایک لمحے کے لیے اس نے کچھ سوچا پھر ایکا ایکی اس نے روپا کے پیلے گال پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ چھت کے چند سوکھے اور گرد سے اٹے ہوئے تنکے دھمک کے مارے نیچے گر پڑے نتھو کی سخت انگلیوں نے روپا کے گال پر کئی نہریں کھود دیں

نتھو نے گرج کر پوچھا''بتا وہ کون ہے؟''

جھونپڑے کے باہر مادھو کے لنگڑے بھائی کی آدھی ٹانگ کانپی، چودھری جس تنکے سے زمین پر ایک اور طوطے کی شکل بنا رہا تھا ہاتھ کانپنے کے باعث دوہرا ہو گیا۔مادھو کاکا نے کلنگ کی طرح اپنی گردن اونچی کر کے جھونپڑے کے اندر دیکھا۔

اندر سے نتھو کی خشم آلود آواز آ رہی تھی مگر یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے آنکھوں ہی آنکھوں میں مادھو کاکا، چودھری اور لنگڑے کیشو نے آپس میں کئی باتیں کیں آخر میں مادھو کاکا کا بھائی بیساکھی ٹیک کر اٹھا۔وہ جھونپڑے میں جانے ہی والا تھا کہ نتھو باہر نکلا کیشو ایک طرف ہٹ گیا نتھو نے پلٹ کر اپنے پیچھے دیکھا اور کہا''آؤ روپا!پھر اس نے روپا کی ماں سے کہا''ماں تم بالکل چنتا نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا ہم شام تک لوٹ آئیں گے۔

کسی نے نتھو سے یہ نہ پوچھا کہ وہ روپا کو لے کر کدھر جا رہا ہے مادھو کا کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ نتھو اور روپا دونوں چبوترے سے اتر کر موری کے اس پار جا چکے تھے چنانچہ وہ اپنی مونچھ کے سفید بال نوچنے میں مصروف ہو گیا اور چودھری کبڑے تنکے کو سیدھا کرنے لگا۔

بھٹے کے مالک لالہ گنیش داس کا لڑکا ستیش جسے بھٹے کے مزدور چھوٹے لالہ جی کہا کرتے تھے اپنے کمرے میں اکیلا چائے پی رہا تھا پاس ہی تپائی پر ایک کھلی ہوئی کتاب رکھی تھی جسے غالباً وہ پڑھ رہا تھا کتاب کی جلد کی طرح اس کا چہرہ بھی جذبات سے خالی تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اپنے چہرے پر غلاف چڑھا رکھا ہے وہ ہر روز اپنے اندر ایک نیا ستیش پاتا تھا وہ جاڑے اور گرمیوں کے درمیانی موسم کی طرح متغیر تھا۔ وہ گرم اور سرد لہروں کا ایک مجموعہ تھا دوسرے دماغ سے سوچتے تھے لیکن وہ ہاتھوں اور پیروں سے سوچتا تھا وہ اپنی عمر کی ان منزلوں کو طے کر رہا تھا جہاں ہر شے کھیل نظر آتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اپنی زندگی کو گیند کی مانند اچھال رہا تھا وہ سمجھتا تھا کہ اچھل کود ہی زندگی کا اصل مقصد ہے اس کو مسلنے سے بہت زیادہ مزہ آتا ہے ہر شے کو وہ مسل کر دیکھتا تھا۔

عورتوں کے متعلق اس کا نظریہ یہ تھا کہ مرد خواہ کتنا ہی بوڑھا ہو جائے مگر اس کو عورت جوان ملنی چاہیئے عورت میں جوانی کو وہ اتنا ہی ضروری خیال کرتا تھا جتنا اپنے ٹینس کھیلنے والے ریکٹ میں بنے ہوئے جال کے اندر تناؤ کو وہ اپنے دوستوں کو کہا کرتا تھا زندگی کے ساز کا ہر تار ہر وقت تنا ہوا ہونا چاہیئے تاکہ ذرا سی جنبش پر بھی وہ لرزنا شروع کر دے

یہ لرزش، یہ کپکپاہٹ جس سے ستیش کو اس قدر پیار تھا دراصل اس کے گندے خون کے کھولاؤ کا نتیجہ تھی جنسی خواہشات اس کے اندر اس قدر زیادہ ہو گئی تھیں کہ جوان حیوانوں کو دیکھ کر بھی اسے لذت محسوس ہوتی تھی وہ جب اپنی گھوڑی کے جوان بچے کے کپکپاتے ہوئے بھورے بدن کو دیکھتا تو اسے ناقابل بیان مسرت حاصل ہوتی تھی اس کو دیکھ کر کئی بار اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہ اپنا بدن اس کے تر و تازہ بدن کے ساتھ گھسے۔

ستیش چائے پی رہا تھا اور دل ہی دل میں چائے دانی کی تعریف کر رہا تھا جو بے داغ سفید چینی کی بنی ہوئی تھی ستیش کو داغ پسند نہیں تھے وہ ہر شے میں ہمواری پسند کرتا تھا، صاف بدن عورتوں کو دیکھ کر اکثر کہا کرتا تھا میری نگاہیں اس عورت پر کئی گھنٹے تیرتی رہیں ۔۔۔۔۔ وہ کس قدر ہموار تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شفاف پانی کی چھوٹی سی جھیل ہے۔

یہ کمرہ جس میں اس وقت ستیش بیٹھا تھا۔ خاص طور پر اس کے لیے بنوایا گیا تھا کمرے کے سامنے ٹینس کورٹ تھا یہاں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ٹینس کھیلتا تھا آج اس نے اپنے دوستوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ ٹینس کھیلنے نہیں آئے گا کیونکہ اسے آج ایک دلچسپ کھیل کھیلنا تھا بھنگی کی جوان لڑکی جس کے متعلق اس نے ایک روز اپنے دوست سے یہ کہا تھا ''تم اسے دیکھو ۔۔۔۔ سچ کہتا ہوں تمہاری نگاہیں اس کے چہرے پر سے پھسل پھسل جائیں گی میری نگاہیں اس کو دیکھنے سے پہلے اس کے کھردرے بالوں کو تھام لیتی ہیں تاکہ پھسل نہ جائیں ۔۔۔۔۔'' آج ایک مدت کے بعد ٹینس کورٹ میں اس سے ملاقات کرنے کے لیے آ رہی تھی۔

وہ چائے پی رہا تھا اور اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چائے میں اس جوان لڑکی کے سانولے رنگ کا عکس پڑ رہا ہے۔

اس کے آنے کا وقت ہو گیا تھا ہر سو کھے پتے کھڑکے تو ستیش نے پیالی میں سے چائے کا آخری گھونٹ پیا اور اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔۔۔۔۔

ایک لمبا سا سایہ ٹینس کورٹ کے جھاڑو دیئے ہوئے سینے پر متحرک ہوا اور لڑکی کے بجائے نتھو نمودار ہوا۔

ستیش نے غور سے اس کی طرف دیکھا کہ آنے والا ایک بھٹے کا مزدور ہے نتھو اپنے سر کے بالوں کا ایک گچھا انگلیوں سے مروڑ رہا تھا اور ٹینس کورٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ستیش کی کرسی برآمدے میں بچھی تھی۔ پاس پہنچ کر نتھو کھڑا ہو گیا اور ستیش کی طرف یوں دیکھنے لگا گویا چھوٹے لالہ جی کو اس کی آمد کی غرض و غایت اچھی طرح معلوم ہے۔

ستیش نے پوچھا "کیا ہے؟"

نتھو خاموشی سے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا "چھوٹے لالہ جی! میں اسے لے کر آیا ہوں اب آپ اسے اپنے پاس رکھ لیجئے، گاؤں والے اسے بہت تنگ کر رہے ہیں"

ستیش حیران ہو گیا اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ نتھو کیا کہہ رہا ہے اس نے پوچھا "کسے؟۔۔۔۔۔کسے تنگ کر رہے ہیں"

نتھو نے جواب دیا "آپ۔۔۔۔۔آپ ۔۔۔۔۔کی روپا کو۔۔۔۔آپ کی چٹنی کو"

"میری پتنی!" ستیش چکرا گیا "میری پتنی ۔۔۔۔ تیرا دماغ تو نہیں بہک گیا ۔۔۔ یہ کیا بک رہا ہے ۔۔۔۔" یہ کہتے ہی اس کے اندر ۔۔۔ بہت اندر روپا کا خیال پیدا ہوا اور اسے یاد آیا کہ پہلے ساون میں وہ ایک موٹی موٹی آنکھوں اور گدرائے ہوئے جسم والی ایک لڑکی سے کچھ دنوں کھیلا تھا۔ وہ دودھ لے کر شہر میں جایا کرتی تھی۔ ایک بار اس نے دودھ کی بوندیں اس کے ابھرتے ہوئے سینے پر ٹپکتی دیکھی تھیں اور ۔۔۔۔۔ ہاں ہاں یہ روپا وہی لڑکی تھی، جس کے بارے میں اس نے ایک بار یہ خیال کیا تھا کہ وہ دودھ سے زیادہ ملائم ہے اس ک حیرت بھی ہوئی تھی کہ یہ اینٹیں بنانے والے ایسی نرم و نازک لڑکیاں کیسے پیدا کر لیتے ہیں۔ وہ بھنگی کی لڑکی کو بھول سکتا تھا سوشیلا کو فراموش کرسکتا تھا جو ہر روز اس کے ساتھ کھیلتی تھی وہ ہسپتال کی نرس کو بھول سکتا تھا۔ جس کے سفید کپڑوں کا وہ بہت معترف تھا وہ اس ۔۔۔۔ لیکن وہ روپا کو نہیں بھول سکتا تھا اسے اچھی طرح یاد تھا کہ دوسری یا تیسری ملاقات پر جبکہ روپا نے آپنا آپ اس کے حوالے کر دیا تھا تو اس کی ایک بات پر اسے بہت ہنسی آتی تھی، روپا نے اس سے کہا تھا چھوٹے لالہ جی! کل سندری چمارن کہہ رہی تھی " جلدی جلدی بیاہ کر لے ری بڑا مزہ آتا ہے ۔۔۔۔ اسے کیا پتہ کہ میں بیاہ کر بھی چکی ہوں" مگر روپا تھی کہاں؟ ستیش کی حیوانی حس اس کا نام سنتے ہی بیدار ہو چکی تھی گو ستیش کا دماغ معاملہ کی نزاکت کو سمجھ گیا تھا مگر اس کا جسم صرف اپنی دلچسپی کی طرف متوجہ تھا۔

ستیش نے پوچھا "کہاں ہے روپا؟"

نتھو اٹھ کھڑا ہوا "باہر کھڑی ہے ۔۔۔۔ میں ابھی اسے لاتا ہوں"

ستیش نے فوراً ہی رعب دار لہجے میں کہا" خبردار جو اسے تو یہاں لایا۔۔۔۔جا بھاگ جا یہاں سے۔"

"پر۔۔۔۔پر۔۔۔۔۔۔چھوٹے لالہ جی وہ۔۔۔۔۔۔وہ آپ کی پتنی ہو چکی ہے۔۔۔۔۔وہ۔۔۔۔۔۔بچے کی ماں بننے والی ہے اور بچہ آپ ہی کا تو ہو گا۔۔۔۔آپ ہی کا تو ہو گا" نتھو نے تتلاتے ہوئے کہا۔

تو روپا حاملہ ہو چکی تھی۔۔۔۔ستیش کو قدرت کی یہ ستم کاری سخت ناپسند تھی اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ عورت اور مرد کے تعلقات کے ساتھ ساتھ یہ حمل کا سلسلہ کیوں جوڑ دیا گیا ہے مرد جب کسی عورت کی خاص خوبی کا معترف ہوتا ہے تو اس کی سزا بچے کی شکل میں کیوں طرفین کو بھگتنا پڑتی ہے۔۔۔۔۔۔۔روپا بچے کے بغیر کتنی اچھی تھی اور وہ اس بچے کے بغیر کتنے اچھے طریقے پر، روپا کے ساتھ تعلقات قائم رکھ سکتا تھا اس سلسلہ تولید کی وجہ سے کئی بار اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ عورت ایک بے کار شے ہے یعنی ہاتھ لگاؤ اور بچہ پیدا ہو جاتا ہے، یہ بھی کوئی بات ہے اب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس بچے کا کیا کرے جو پیدا ہو رہا تھا۔تھوڑی دیر غور کر کے اس نے نتھو کو اپنے پاس بٹھایا اور بڑے آرام سے کہا۔

"تم روپا کے کیا لگتے ہو۔۔۔۔۔خیر چھوڑو اس قصے کو۔۔۔۔دیکھو، یہ بچے وچے کی بات مجھے یہ پسند نہیں مفت میں ہم دونوں بدنام ہو جائیں گے تم ایسا کرو، روپا کو یہاں چھوڑ جاؤ۔۔۔۔میں اسے آج ہی کسی ایسی جگہ بھجوا دوں گا۔جہاں یہ بچہ ضائع کر دیا جائے۔۔۔۔۔اور روپا کو میں کچھ روپے دے دوں گا وہ خوش ہو جائے گی۔۔۔۔تمہارا انعام بھی تمہیں مل جائے گا۔۔۔۔ٹھہرو"

یہ کہہ کر ستیش نے اپنی جیب سے بٹوہ نکالا اور دس روپے کا نوٹ نتھو کے ہاتھ میں دے کر کہا "یہ رہا تمہارا انعام ۔۔۔ جاؤ عیش کرو"

نتھو چپکے سے اٹھا دس روپے کا نوٹ اس نے اچھی طرح مٹھی میں دبا لیا اور وہاں سے چل دیا ستیش نے اطمینان کا سانس لیا کہ چلو چھٹی ہوئی اب وہ بھنگی کی لڑکی کی بابت سوچنے لگا کہ اگر اسے بھی ۔۔۔۔ مگر یہ کیا نتھو روپا کے ساتھ واپس آ رہا تھا۔

روپا کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور وہ یوں چل رہی تھی جیسے اسے بہت تکلف ہو رہی تھی ستیش نے سوچا "یہ بچہ پیدا کرنا بھی ایک اچھی خاصی مصیبت معلوم ہوتی ہے"

نتھو اور روپا دونوں برآمدے کی سیڑھیوں کے پاس کھڑے ہو گئے ستیش نے روپا کی طرف دیکھے بغیر کہا "دیکھو روپا! میں نے ۔۔۔ اس کو سب کچھ سمجھا دیا ہے تم فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا ۔۔۔ سمجھیں ۔۔۔ کیوں بھئی تم نے اسے سب کچھ بتا دیا؟"

نتھو نے دس روپے کا نوٹ خاموشی سے ستیش کی طرف بڑھا دیا اور کہا "چھوٹے لالہ جی! کاغذ کے اس ٹکڑے سے آپ مجھے خریدنا چاہتے ہیں میں تو ایک بہت بڑا سودا کرنے آیا تھا"

ستیش نے سمجھا کہ نتھو شاید دس روپے سے زیادہ مانگتا ہے "کتنے روپے چاہئیں تجھے ۔۔۔ میرے پاس اس وقت پچاس ہیں، لینا ہوں تو لے جاؤ"

نتھو نے روپا کی طرف دیکھا روپا کی آنکھوں سے آنسو نکل کر سیمنٹ سے لپی

ہوئی سیڑھیوں پر ٹپک رہے تھے اس کے دل پر یہ قطرے پگھلے ہوئے سیسے کی طرح گر رہے تھے۔ ستیش کی طرف اس نے مڑ کر کہا" چھوٹے لالہ جی! یہ آپ کی پتنی ہے آپ اس کے بچے کے باپ ہیں۔۔۔ جیسے بڑے لالہ جی آپ کے پتا ہیں۔۔۔۔۔روپا کے لیے اور کوئی جگہ نہیں ہے، وہ آپ کے پاس رہے گی اور آپ اسے پتنی بنا کر رکھیں گے۔۔۔۔سب گاؤں والے اسے دھتکار رہے ہیں، کس لیے۔۔۔۔اس لیے کہ وہ آپ کا بچہ اپنے پیٹ میں لیے لیے پھرتی ہے۔۔۔۔۔آپ کو تھامنا پڑے گا اس لڑکی کا ہاتھ جس نے آپ کو اپنا سب کچھ دے دیا۔۔۔۔آپ کا دل پتھر کا نہیں ہے چھوٹے لالہ جی! اور اس چھوکری کا دل بھی پتھر نہیں ہے۔۔۔۔۔آپ نے اس کو سہارا نہ دیا تو اور کون دے گا یہ آتی نہیں تھی رو رو کے اپنی جان ہلکان کر رہی تھی میں نے اسے سمجھایا اور کہا پگلی تو کیوں روتی ہے تیرا پتی جیتا ہے چل میں تجھے اس کے پاس لے چلوں"

ستیش کو پتی پتنی کا مطلب ہی سمجھ میں نہ آتا تھا" دیکھو بھائی! زیادہ بکواس نہ کرو تم یوں ڈرا دھمکا کر مجھ سے زیادہ روپیہ وصول نہیں کر سکتے۔ میں ایک سو روپیہ دینے پر راضی ہوں مگر شرط یہ ہے کہ بچہ ضائع کر دیا جائے اور تم جو مجھ سے یہ کہتے ہو کہ میں اسے اپنے گھر میں بسا لوں تو یہ ناممکن ہے۔۔۔میں اس کا پتی خواب میں بھی نہیں بنا اور نہ یہ میری کبھی پتنی بنی ہے۔۔۔۔۔۔سمجھے؟ سو روپیہ لینا ہو تو کل آ کے یہاں سے لے جانا اب یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤ۔"

نتھو بھنا گیا

"اور۔۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔یہ بچہ کیا آسمان سے آ گیا ہے؟۔۔۔۔۔اس کی

آنکھوں میں آنسو بھوت پریتوں نے بھر دیئے ہیں۔۔۔۔میرا دل۔۔۔۔میرا دل کون مسل رہا ہے۔۔۔یہ روپے۔۔۔۔۔۔یہ سو روپے کیا آپ خیرات کے طور پر دے رہے ہیں۔۔۔۔۔۔کچھ ہوا ہے تو سب کچھ ہو رہا ہے۔۔۔۔۔کوئی بات ہے تو یہ ہلچل مچ رہی ہے۔۔۔۔آپ اس کے بچے کے باپ ہیں تو کیا اس کے پتی نہیں؟۔۔۔۔۔۔۔میری عقل کو کچھ ہو گیا ہے یا آپ کی سمجھ کو۔۔۔۔''

ستیش یہ تقریر برداشت نہ کر سکا ''الو کے پٹھے! تو جاتا ہے کہ نہیں یہاں سے، کھڑا اپنی منطق چھانٹ رہا ہے، جا جو کچھ کرنا ہے کر لے۔۔۔۔دیکھوں تو میرا کیا بگاڑ لے گا۔''

نتھو نے ہولے سے کہا ''میں تو سنوارنے آیا تھا چھوٹے لالہ جی۔۔۔۔آپ ناحق کیوں بگڑ رہے ہیں آپ کیوں نہیں اس کا ہاتھ تھام لیتے یہ آپ کی پتنی ہے۔''

''پتنی کے بچے، اب تو اپنی بکواس بند کرے گا یا نہیں۔۔۔۔۔۔۔بچہ بچہ کیا بک رہا ہے۔۔۔۔جا لے جا اپنی اس کچھ لگتی کو، ورنہ یاد رکھ، کھال ادھیڑ دوں گا۔''

نتھو کے سب پٹھے اکڑ گئے ''بھگوان کی قسم، مجھ میں اتنی شکتی ہے کہ یوں ہاتھوں میں دبا کر تیرا سارا لہو نچوڑ دوں۔۔۔۔میری کھال تیرے ان نازک ہاتھوں سے ادھڑے گی۔۔۔۔میں تیری بوٹی بوٹی نوچ سکتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔پر میں کچھ نہیں کر سکتا۔۔۔۔میں تجھے ہاتھ تک نہیں لگانا چاہتا۔۔۔۔۔۔۔تو روپا کے بچے کا باپ ہے، تو روپا کا پتی ہے اگر میں نے تجھ پر ہاتھ اٹھایا تو مجھے ڈر ہے کہ روپا کے دل کو دھکا لگے گا۔۔۔۔۔تو عورتوں سے ملتا جلتا ہے پر تو عورت کا دل نہیں

رکھتا۔"

ستیش آپے سے باہر ہو گیا اور چیخنے لگا "تیری اور تیری روپا کی ایسی تیسی۔۔۔۔نکل یہاں سے باہر"

نھتو بڑھ کر روپا کے آگے کھڑا ہو گیا اور ستیش کے پاس۔۔۔۔۔بالکل پاس جا کر کہنے لگا "چھوٹے لالہ جی مجھے معاف کر دیجئے میں نے ایسی باتیں کہہ دی ہیں جو مجھے نہیں کہنا چاہیے تھیں۔۔۔۔مجھے معاف کر دیجئے مگر روپا کا ہاتھ تھام لیجئے۔۔۔۔آپ اس کے پتی ہیں، اس کے بھاگ میں آپ کے بنا اور کوئی مرد نہیں لکھا گیا یہ آپ کی ہے۔۔۔اب آپ اسے اپنا لیں۔۔۔یہ دیکھئے میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں"

"کیسے واہیات آدمی سے واسطہ پڑا ہے" ستیش نے کمرے کے اندر جاتے ہوئے کہا "کہتا ہوں میں روپو وپا کو نہیں جانتا مگر یہ خواہ مخواہ سے میرے پلے باندھ رہا ہے۔۔۔۔جاؤ جاؤ ہوش کی دوا کرو"

کمرے کا صرف دروازہ کھلا تھا جس میں سے ستیش اندر داخل ہوا تھا اندر داخل ہو کر اس نے یہ دروازہ بند کر دیا نھتو نے دروازے کی لکڑی کی طرف دیکھا تو اسے ستیش کے چہرے اور اس میں کوئی فرق نہ آیا۔

نھتو نے اپنے سر کے بال مروڑنے شروع کیے اور جب پلٹ کر اس نے روپا سے کچھ کہنا چاہا تو وہ جا چکی تھی۔۔۔۔وہ اس کا پیچھا کرنے کے لیے بھاگا مگر وہ جا چکی تھی باہر نکل کر اس نے روپا کو بہت دور درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوتے دیکھا وہ اس کے پیچھے یہ کہتا ہوا بھاگا "روپا۔۔۔روپا ٹھہر جا۔۔۔۔میں ایک بار

پھر اسے سمجھاؤں گا۔۔۔۔وہی تیرا پتی ہے۔۔۔۔اس کا گھر ہی تیری اصل جگہ ہے۔''

وہ بہت دیر تک بھاگتا رہا مگر روپا بہت دور نکل گئی تھی۔۔۔۔اس روز سے آج تک نتھو، روپا کی تلاش میں سرگرداں ہے مگر وہ اسے نہیں ملتی وہ لوگوں سے کہتا ہے ''میں روپا کے پتی کو جانتا ہوں۔۔۔۔۔تم اسے ڈھونڈ کر لا دو میں اسے اس کے پتی سے ملاؤں گا''

لوگ یہ سن کر ہنس دیتے ہیں۔۔۔۔۔۔بچے جب بھی نتھو کو دیکھتے ہیں تو اس سے پوچھتے ہیں ''اس کا پتی کون ہے نتھو بھیا!'' تو نتھو ان کو مارنے کے لیے دوڑتا ہے۔



اللہ دتا

دو بھائی تھے اللہ رکھا اور اللہ دتا دونوں ریاست پٹیالہ کے باشندے تھے ان کے آباؤ اجداد البتہ لاہور کے تھے مگر جب ان دو بھائیوں کا دادا ملازمت کی تلاش میں پٹیالہ آیا تو وہیں کا ہو رہا۔

اللہ رکھا اور اللہ دتا دونوں سرکاری ملازم تھے ایک چیف سیکرٹری صاحب بہادر کا اردلی تھا، دوسرا کنٹرولر آف سٹورز کے دفتر کا چپراسی۔

دونوں بھائی ایک ساتھ رہتے تھے تاکہ خرچ کم ہو بڑی اچھی گزر رہی تھی ایک طرف اللہ رکھا جو بڑا تھا، اور کبھی کبھی کسی غریب اور نادار عورت کو پھانس بھی لیا کرتا تھا مگر اللہ رکھا نے ہمیشہ چشم پوشی سے کام لیا تھا کہ گھر کا امن وسکون درہم برہم نہ ہو۔

دونوں شادی شدہ تھے اللہ رکھا کی دو لڑکیاں تھیں ایک بیاہی جا چکی تھی اور اپنے گھر میں خوش تھی دوسری جس کا نام صغریٰ تھا، تیرہ برس کی تھی اور پرائمری سکول میں پڑھتی تھی۔

اللہ دتا کی ایک لڑکی تھی۔۔۔۔۔۔زینب۔۔۔۔۔۔اس کی شادی ہو چکی تھی مگر اپنے گھر میں کوئی اتنی خوش نہیں تھی اس لیے کہ اس کا خاوند اوباش تھا پھر بھی وہ جوں توں نبھائے جا رہی تھی۔

زینب اپنے بھائی طفیل سے تین سال بڑی تھی اس حساب سے طفیل کی عمر اٹھارہ انیس برس کے قریب ہوتی تھی وہ لوہے کے ایک چھوٹے سے کارخانے

میں کام سیکھ رہا تھا لڑکا ذہین تھا چنانچہ کام سیکھنے کے دوران میں بھی پندرہ روپے ماہوار اسے مل جاتے تھے۔

دونوں بھائیوں کی بیویاں بڑی اطاعت شعار، محنتی اور عبادت گزار عورتیں تھیں۔۔۔۔۔ انہوں نے اپنے شوہروں کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔

زندگی بڑی ہموار گزر رہی تھی کہ ایکا ایکی ہندو مسلم فساد شروع ہو گئے دونوں بھائیوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کے مال و جان اور عزت آبرو پر حملہ ہو گا اور انہیں نہایت افراتفری اور کسمپرسی کے عالم میں ریاست پٹیالہ چھوڑنا پڑے گی۔۔۔۔ مگر ایسا ہوا۔

دونوں بھائیوں کو قطعاً معلوم نہیں کہ اس خونیں طوفان میں کون سا درخت گرا۔ کون سے درخت کی کون سی ٹہنی ٹوٹی۔۔۔۔۔ جب ہوش و حواس کسی قدر درست ہوئے تو چند حقیقتیں سامنے آئیں اور وہ لرز گئے۔

اللہ رکھا کی لڑکی کا شوہر شہید کر دیا گیا تھا اور اس کی بیوی کو بلوائیوں نے بڑی بے دردی سے ہلاک کر دیا تھا۔

اللہ دتا کی بیوی کو بھی سکھوں نے کرپانوں سے کاٹ ڈالا تھا اس کی لڑکی زینب۔۔۔۔۔ کا بد چلن شوہر بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

رونا دھونا بیکار تھا۔ صبر شکر کر کے بیٹھ رہے۔۔۔۔ پہلے تو کیمپوں میں گلتے سڑتے رہے پھر گلی کوچوں میں بھیک مانگا کیے آخر خدا نے سن لی اللہ دتا کو گوجرانوالہ میں ایک چھوٹا سا شکستہ مکان سر چھپانے کو مل گیا طفیل نے دوڑ دھوپ کی تو اسے کام مل گیا۔

اللہ رکھا لاہور ہی میں دیر تک دربدر پھرتا رہا جوان لڑکی ساتھ تھی گویا ایک پہاڑ کا پہاڑ اس کے سر پر کھڑا تھا یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس غریب نے کس طرح ڈیڑھ برس گزارا بیوی اور بڑی لڑکی کا غم وہ بالکل بھول چکا تھا۔ قریب تھا کہ وہ کوئی خطرناک قدم اٹھائے کہ اسے ریاست پٹیالہ کے ایک بڑے افسر مل گئے جو اس کے بڑے مہربان تھے اس نے ان کو اپنی حالت زار الف سے لے کر یے تک سنائی آدمی رحم دل تھا اس کو بڑی دقتوں کے بعد لاہور کے ایک عارضی دفتر میں اچھی ملازمت مل گئی تھی، چنانچہ انہوں نے دوسرے روز ہی اس کو چالیس روپیہ ماہوار پر ملازم رکھ لیا اور ایک چھوٹا سا کوارٹر بھی رہائش کے لیے دلوا دیا۔

اللہ رکھا نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے اس کی مشکلات دور کیں اب وہ آرام سے سانس لے سکتا تھا اور مستقبل کے متعلق اطمینان سے سوچ سکتا تھا صغریٰ بڑی سلیقے والی سگھڑ لڑکی تھی سارا دن گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی ادھر ادھر سے لکڑیاں چن کر لاتی چولہا سلگاتی اور مٹی کی ہنڈیا میں ہر روز اتنا سالن پکاتی جو دو وقت کے لیے پورا ہو جائے آٹا گوندھتی پاس ہی تنور تھا وہاں جا کر روٹیاں لگوا لیتی۔

تنہائی میں آدمی کیا کچھ نہیں سوچتا۔ طرح طرح کے خیالات آتے ہیں صغریٰ عام طور پر دن میں تنہا ہوتی تھی اور اپنی بہن اور ماں کو یاد کر کے آنسو بہاتی رہتی تھی، پر جب باپ آتا تو وہ اپنی آنکھوں میں سارے آنسو خشک کر لیتی تھی تاکہ اس کے زخم ہرے نہ ہوں لیکن وہ اتنا جانتی تھی کہ اس کا باپ اندر ہی اندر گھلا جا رہا ہے اس کا دل ہر وقت روتا رہتا ہے مگر وہ کسی سے کہتا نہیں صغریٰ سے بھی اس نے کبھی اس

کی ماں اور بہن کا ذکر نہیں کیا تھا۔

زندگی افتاں وخیزاں گزر رہی تھی ادھر گوجرانوالہ میں اللہ دتا اپنے بھائی کے مقابلے میں کسی قدر خوش حال تھا، کیونکہ اسے بھی ملازمت مل گئی تھی اور زینب بھی تھوڑا بہت سلائی کا کام کر لیتی تھی مل ملا کے کوئی ایک سو روپے ماہوار ہو جاتے تھے جو تینوں کے لیے بہت کافی تھے۔

مکان چھوٹا تھا، مگر ٹھیک تھا اوپر کی منزل میں طفیل رہتا تھا، نچلی منزل میں زینب اور اس کا باپ دونوں ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اللہ دتا اسے زیادہ کام نہیں کرنے دیتا تھا چنانچہ منہ اندھیرے اٹھ کر وہ صحن میں جھاڑو دے کر چولہا سلگا دیتا تھا کہ زینب کا کام کچھ ہلکا ہو جائے وقت ملتا تو وہ دو تین گھڑے بھر کر گھڑونجی پر رکھ دیتا تھا۔

زینب نے اپنے شہید خاوند کو کبھی یاد نہیں کیا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس کی زندگی میں کبھی تھا ہی نہیں وہ خوش تھی اپنے باپ کے ساتھ بہت خوش تھی بعض اوقات وہ اس سے لپٹ جاتی تھی۔۔۔ طفیل کے سامنے بھی اور اس کو خوب چومتی تھی۔

صغریٰ اپنے باپ سے ایسے چہل نہیں کرتی تھی۔۔۔۔ اگر ممکن ہوتا تو وہ اس سے پردہ کرتی اس لیے نہیں کہ وہ کوئی نامحرم تھا نہیں۔۔۔ صرف احترام کے لیے۔۔۔ اس کے دل سے کئی دفعہ یہ دعا اٹھتی ''یا پروردگار۔۔۔ میرا باپ میرا جنازہ اٹھائے''

بعض اوقات کئی دعائیں الٹی ثابت ہوتی ہیں جو خدا کو منظور تھا، وہی ہونا تھا

غریب صغریٰ کے سر پر غم واندوہ کا ایک اور پہاڑ ٹوٹا تھا۔

جون کے مہینے دوپہر کو دفتر کے کسی کام پر جاتے ہوئے تپتی ہوئی سڑک پر اللہ رکھا کو ایسی لو لگی کہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ لوگوں نے اٹھایا ہسپتال پہنچایا مگر دوا دارو نے کوئی کام نہ کیا۔

صغریٰ باپ کی موت کے صدمے سے نیم پاگل ہوگئی اس نے قریب قریب اپنے آدھے بال نوچ ڈالے کہ ہمسایوں نے بہت دم دلاسا دیا۔ مگر یہ کارگر کیسے ہوتا۔۔۔۔ وہ ایسی کشتی کے مانند تھی جس کا بادبان ہو نہ کوئی چپو اور بیچ منجدھار کے آن پھنسی ہو۔

پٹیالے کے وہ افسر جنہوں نے مرحوم اللہ رکھا کو ملازمت دلوائی تھی فرشتہ رحمت ثابت ہوئے ان کو جب اطلاع ملی تو دوڑے آئے سب سے پہلے انہوں نے یہ کام کیا کہ صغریٰ کو موٹر میں بٹھا کر گھر چھوڑ آئے اور اپنی بیوی سے کہا کہ وہ اس کا خیال رکھے۔ پھر ہسپتال جا کر انہوں نے اللہ رکھا کے غسل وغیرہ کا وہیں انتظام کیا اور دفتر والوں سے کہا کہ وہ اس کو دفنا آئیں۔

اللہ دتا کو اپنے بھائی کے انتقال کی خبر بڑی دیر کے بعد ملی بہرحال وہ لاہور آیا اور پوچھتا پاچھتا وہاں پہنچ گیا جہاں صغریٰ تھی اس نے اپنی بھتیجی کو بہت دم دلاسا دیا بہلایا سینے کے ساتھ لگایا پیار کیا، دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کیا، بہادر بننے کو کہا، مگر صغریٰ کے پھٹے ہوئے دل پر ان تمام باتوں کا کیا اثر ہوتا غریب خاموش اپنے آنسو دوپٹے میں خشک کرتی رہی۔

اللہ دتا نے افسر صاحب سے آخر میں کہا ”میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں

میری گردن آپ کے احسانوں تلے ہمیشہ دبی رہے گی مرحوم کی تجہیز و تکفین کا آپ نے بندوبست کیا پھر یہ بچی جو بالکل بے آسرا رہ گئی تھی، اس کو آپ نے اپنے گھر میں جگہ دی۔۔۔۔خدا آپ کو اس کا اجر دے۔۔اب میں اسے اپنے ساتھ لیے جاتا ہوں میرے بھائی کی بڑی قیمتی نشانی ہے۔"

افسر صاحب نے کہا"ٹھیک ہے۔۔۔۔۔لیکن تم ابھی اسے کچھ دیر اور یہاں رہنے دو۔۔۔۔۔طبیعت سنبھل جائے تو لے جانا"

اللہ دتا نے کہا"حضور! میں نے ارادہ کیا ہے کہ اس کی شادی اپنے لڑکے سے کروں گا اور بہت جلدی!"

افسر صاحب بہت خوش ہوئے"بڑا نیک ارادہ ہے۔۔۔۔لیکن اس صورت میں جب کہ تم اس کی شادی اپنے لڑکے سے کرنے والے ہو اس کا اسی گھر میں رہنا مناسب نہیں تم شادی کا بندوبست کرو مجھے تاریخ سے مطلع کر دینا خدا کے فضل و کرم سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

بات درست تھی اللہ دتا واپس گوجرانوالہ چلا گیا زینب اس کی غیر موجودگی میں بڑی اداس ہو گئی تھی جب وہ گھر میں داخل ہوا تو اس سے لپٹ گئی اور کہنے لگی کہ اس نے اتنی دیر کیوں لگائی

اللہ دتا نے پیار سے اسے ایک طرف ہٹایا"ارے بابا، آنا جانا، کیا ہے۔۔۔۔قبر پر فاتحہ پڑھنی تھی صغریٰ سے ملنا تھا، اسے یہاں لانا تھا"

زینب نہ معلوم کیا سوچنے لگی"صغریٰ کو یہاں لانا تھا" ایک دم چونک کر"ہاں۔۔۔۔صغریٰ کو یہاں لانا تھا پر وہ کہاں ہے؟"

''وہیں ہے۔۔۔۔۔۔پٹیالے کے ایک بڑے نیک دل افسر ہیں ان کے پاس ہے انہوں نے کہا جب تم اس کی شادی کا بندوبست کر لوگے تو لے جانا'' یہ کہتے ہوئے اس نے بیڑی سلگائی۔

زینب نے بڑی دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا ''اس کی شادی کا بندوبست کر رہے ہو؟۔۔۔۔کوئی لڑکا ہے تمہاری نظر میں؟''

اللہ دتا نے زور کا کش لیا ''ارے بھئی، اپنا طفیل۔۔۔۔۔۔۔۔۔میرے بھائی کی صرف ایک ہی نشانی تو ہے۔۔۔۔میں اسے کیا غیروں کے حوالے کردوں گا''

زینب نے ٹھنڈی سانس بھری ''تو صغریٰ کی شادی طفیل سے کرو گے؟''

اللہ دتا نے جواب دیا ''ہاں۔۔۔۔۔کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟''

زینب نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا ''ہاں۔۔۔۔۔۔اور تم جانتے ہو کیوں ہے۔۔۔۔یہ شادی ہرگز نہیں ہوگی؟''

اللہ دتا مسکرایا زینب کی ٹھوڑی پکڑ کا س نے اس کا منہ چوما ''پگلی۔۔۔۔۔۔ہر بات پر شک کرتی ہے۔۔۔۔اور باتوں کو چھوڑ، آخر میں تمہارا باپ ہوں''

زینب نے بڑے زور سے ''ہونہہ'' کی ''باپ!'' اور اندر کمرے میں جا کر رونے لگی

اللہ دتا اس کے پیچھے گیا اور اس کو پچکارنے لگا

دن گزر گئے طفیل فرمانبردار لڑکا تھا جب اس کے باپ نے صغریٰ کی بات کی تو وہ فوراً مان گیا آخر تین چار مہینے کے بعد تاریخ مقرر ہوگئی۔۔۔۔۔افسر صاحب نے فوراً صغریٰ کے لیے ایک بہت اچھا جوڑا سلوایا جو اسے شادی کے دن پہننا تھا

ایک انگوٹھی بھی لے دی پھر اس نے محلے والوں سے اپیل کی کہ وہ ایک یتیم لڑکی کی شادی کے لیے جو بالکل بے سہارا ہے، حسب توفیق کچھ دیں۔

صغریٰ کو قریب قریب سبھی جانتے تھے اور اس کے حالات سے واقف تھے، چنانچہ انہوں نے مل ملا کر اس کے لیے بڑا اچھا جہیز تیار کر دیا۔

صغریٰ دلہن بنی تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ تمام دکھ جمع ہو گئے ہیں اور اس کو پیٹ رہے ہیں بہر حال وہ اپنے سسرال پہنچی جہاں اس کا استقبال زینب نے کیا، کچھ اس طرح کہ صغریٰ کو اسی وقت معلوم ہو گیا کہ وہ اس کے ساتھ بہنوں کا سا سلوک کبھی نہیں کرے گی بلکہ ساس کی طرح پیش آئے گی۔

صغریٰ کا اندیشہ درست تھا اس کے ہاتھوں کی مہندی ابھی اچھی طرح اترنے بھی نہیں پائی تھی کہ زینب نے اس سے نوکروں کے کام لینے شروع کر دیئے، جھاڑو دیتی، برتن وہ مانجھتی، چولہا وہ جھونکتی، پانی وہ بھرتی یہ سب کام وہ بڑی پھرتی اور بڑے سلیقے سے کرتی لیکن پھر بھی زینب خوش نہ ہوتی بات بات پر اس کو ڈانٹتی، ڈپٹتی، جھڑکتی رہتی۔

صغریٰ نے دل میں تہیہ کر لیا تھا، وہ یہ سب کچھ برداشت کرے گی اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائے گی کیونکہ اگر اسے یہاں سے دھکا مل گیا تو اس کے لیے اور کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

اللہ دتا کا سلوک البتہ اس سے برا نہیں تھا زینب کی نظر بچا کر کبھی کبھی وہ اس کو پیار کر لیتا تھا اور کہتا تھا کہ وہ کچھ فکر نہ کرے سب ٹھیک ہو جائے گا۔

صغریٰ کو اس سے بہت ڈھارس ہوتی زینب جب کبھی اپنی کسی سہیلی کے ہاں

جاتی اور اللہ دتا اتفاق سے گھر پر ہوتا تو وہ اس سے دل کھول کر پیار کرتا۔ اس سے بڑی میٹھی میٹھی باتیں کرتا کام میں اس کا ہاتھ بٹاتا اس کے واسطے اس نے جو چیزیں چھپا کر رکھی ہوتی تھیں، دیتا اور سینے کے ساتھ لگا کر اس سے کہتا ''صغریٰ تم بڑی پیاری ہو!''

صغریٰ جھینپ جاتی دراصل وہ اتنے پر جوش پیار کی عادی نہیں تھی اس کا مرحوم باپ اگر کبھی اسے پیار کرنا چاہتا تھا تو صرف اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیا کرتا تھا یا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر یہ دعا دیا کرتا تھا ''خدا میری بیٹی کے نصیب اچھے کرے''

صغریٰ، طفیل سے بہت خوش تھی وہ بڑا اچھا خاوند تھا جو کماتا تھا اس کے حوالے کر دیتا تھا، مگر صغریٰ زینب کو دے دیتی تھی اس لیے کہ وہ اس کے قہر و غضب سے ڈرتی تھی۔

طفیل سے صغریٰ نے زینب کی بدسلوکی اور اس کے ساتھ ایسے برتاؤ کا کبھی ذکر نہیں کیا تھا وہ صلح کل تھی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے باعث گھر میں کسی قسم کی بدمزگی پیدا ہو اور بھی کئی باتیں تھیں جو وہ طفیل سے کہنا چاہتی تو کہہ دیتی مگر اسے ڈر تھا کہ طوفان برپا ہو جائے گا اور سب اس میں سے بچ کر نکل جائیں گے مگر وہ اکیلی اس میں پھنس جائے گی اور اس کی تاب نہ لا سکے گی۔

یہ خاص باتیں اسے چند روز ہوئے معلوم ہوئی تھیں اور وہ کانپ کانپ گئی تھی۔ اب اللہ دتا اسے پیار کرنا چاہتا تو وہ الگ ہٹ جاتی، یا دوڑ کر اوپر چلی جاتی، جہاں وہ اور طفیل رہتے تھے۔

طفیل کو جمعہ کی چھٹی ہوتی تھی اللہ دتا کو اتوار کی اگر زینب گھر پر ہوتی تو وہ جلدی جلدی کام کاج ختم کر کے اوپر چلی جاتی اگر اتفاق سے اتوار کو زینب کہیں باہر گئی ہوتی تو صغریٰ کی جان پر بنی رہتی ڈر کے مارے اس سے کام نہ ہوتا لیکن زینب کا خیال آتا تو اسے مجبوراً کانپتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل سے طوعاً و کرہاً سب کچھ کرنا پڑتا۔ اگر وہ کھانا وقت پر نہ پکائے تو اس کا خاوند بھوکا رہے، کیونکہ وہ ٹھیک بارہ بجے اپنا شاگرد روٹی کے لیے بھیج دیتا تھا۔

ایک دن اتوار کو جب کہ زینب گھر پر نہیں تھی اور وہ آٹا گوندھ رہی تھی اللہ دتا پیچھے سے دبے پاؤں آیا اور کھلنڈرے انداز میں اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ وہ تڑپ کر اٹھی مگر اللہ دتا نے اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔

صغریٰ نے چیخنا شروع کر دیا مگر وہاں سننے والا کون تھا اللہ دتا نے کہا "شور مت مچاؤ۔۔۔۔۔ یہ سب بے فائدہ ہے۔۔۔۔ چلو آؤ"

وہ چاہتا تھا کہ صغریٰ کو اٹھا کر اندر لے جائے وہ کمزور تھی مگر خدا جانے اس میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی کہ اللہ دتا کی گرفت سے نکل گئی اور ہانپتی کانپتی اوپر پہنچ گئی کمرے میں داخل ہو کر اس نے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

تھوڑی دیر کے بعد زینب آگئی اللہ دتا کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اندر کمرے میں لیٹ کر اس نے زینب کو پکارا وہ آئی تو اس سے کہا "ادھر آؤ میری ٹانگیں دباؤ۔۔۔ زینب اچک کر پلنگ پر بیٹھ گئی اور اپنے باپ کی ٹانگیں دبانے لگی تھوڑی دیر کے بعد دونوں کے سانس تیز تیز چلنے لگے۔"

زینب نے اللہ دتا سے پوچھا "کیا بات ہے۔۔۔۔۔ آج تم اپنے آپ

میں نہیں ہو"

اللہ دتا نے سوچا کہ زینب سے چھپانا فضول ہے، چنانچہ اس سارا ماجرا بیان کر دیا۔۔۔زینب آگ بگولا ہوگئی" کیا ایک کافی نہیں تھی۔۔۔۔۔تمہیں پہلے تو شرم نہ آئی پر اب تو آنی چاہیے تھی۔۔۔مجھے معلوم تھا کہ ایسا ہوگا، اسی لیے میں شادی کے خلاف تھی۔۔۔اب ان تو کہ صغریٰ اس گھر میں نہیں رہے گی!"

اللہ دتا نے بڑے مسکین لہجے میں پوچھا "کیوں؟"

زینب نے کھلے طور پر کہا "میں اس گھر میں اپنی موت دیکھنا نہیں چاہتی"

اللہ دتا کا حلق خشک ہوگیا اس کے منہ سے کوئی بات نکل نہ سکی

زینب باہر نکلی تو اس نے دیکھا کہ صغریٰ صحن میں جھاڑو دے رہی ہے چاہتی تھی کہ اس سے کچھ کہے مگر خاموش رہی۔

اس واقعے کو دو مہینے گزر گئے۔۔۔۔۔۔صغریٰ نے محسوس کیا کہ طفیل اس سے کھچا کھچا رہتا تھا ذرا ذرا سی بات پر اس کو شک کی نگاہوں سے دیکھتا ہے آخر ایک دن آیا کہ ان نے طلاق نامہ اس کے ہاتھ میں دیا اور گھر سے باہر نکال دیا۔

☆☆☆☆☆☆

الو کا پٹھا

قاسم صبح سات بجے لحاف سے باہر نکلا اور غسل خانے کی طرف چلا راستے میں، یہ اس کو ٹھیک طور پر معلوم نہیں، سونے والے کمرے میں، صحن میں یا غسل خانے کے اندر اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کسی کو الو کا پٹھا کہے بس صرف ایک بار غصے میں یا طنزیہ انداز میں کسی کو الو کا پٹھا کہہ دے۔

قاسم کے دل میں اس سے پہلے کئی بار بڑی بڑی انوکھی خواہشیں پیدا ہو چکی تھیں مگر یہ خواہش سب سے نرالی تھی وہ بہت خوش تھا رات اس کو بڑی پیاری نیند آئی تھی وہ خود کو بہت تازہ محسوس کر رہا تھا لیکن پھر یہ خواہش کیسے اس کے دل میں داخل ہو گئی۔ دانت صاف کرتے وقت اس نے ضرورت سے زیادہ وقت صرف کیا جس کے باعث اس کے مسوڑھے چھل گئے دراصل وہ سوچتا رہا کہ یہ عجیب و غریب خواہش کیوں پیدا ہوئی مگر وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔

بیوی سے وہ بہت خوش تھا ان میں کبھی لڑائی نہ ہوئی تھی نوکروں پر بھی وہ ناراض نہیں تھا اس لیے کہ غلام محمد اور نبی بخش دونوں خاموشی سے کام کرنے والے مستعد نوکر تھے۔ موسم بھی نہایت خوشگوار تھا فروری کے سہانے دن تھے جن میں کنوارپنے کی تازگی تھی ہوا خنک اور ہلکی دن چھوٹے نہ راتیں لمبی نیچر کا توازن بالکل ٹھیک تھا اور قاسم کی صحت بھی خوب تھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کسی کو بغیر وجہ کے الو کا پٹھا کہنے کی خواہش اس کے دل میں کیوں کر پیدا ہو گئی۔

قاسم نے اپنی زندگی کے اٹھائیس برسوں میں متعدد لوگوں کو الو کا پٹھا کہا ہو گا

اور بہت ممکن ہے کہ اس سے بھی کڑے لفظ اس نے بعض موقعوں پر استعمال کیے ہوں اور گندی گالیاں بھی دی ہوں مگر اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ایسے موقعوں پر خواہش بہت پہلے اس کے دل میں پیدا نہیں ہوئی تھی مگر اب اچانک طور پر اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ کسی کو الو کا پٹھا کہنا چاہتا ہے اور یہ خواہش لمحہ بہ لمحہ شدت اختیار کرتی چلی گئی جیسے اس نے اگر کسی کو الو کا پٹھا نہ کہا تو بہت بڑا ہرج ہو جائے گا۔

دانت صاف کرنے کے بعد اس نے چھلے ہوئے مسوڑھوں کو اپنے کمرے میں جا کر آئینے میں دیکھا مگر دیر تک ان کو دیکھتے رہنے سے بھی وہ خواہش نہ دبی جو ایکا ایکی اس کے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔

قاسم منطقی قسم کا آدمی تھا وہ بات کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کا عادی تھا آئینہ میز پر رکھ کر وہ آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور ٹھنڈے دماغ سے سوچنے لگا۔

"مان لیا کہ میرا کسی کو الو کا پٹھا کہنے کو جی چاہتا ہے۔۔۔ مگر یہ کوئی بات تو نہ ہوئی۔۔ میں کسی کو الو کا پٹھا کیوں کہوں۔۔۔؟ میں کسی سے ناراض بھی تو نہیں ہوں۔۔۔"

یہ سوچتے سوچتے اس کی نظر سامنے دروازے کے بیچ میں رکھے ہوئے حقے پر پڑی۔ ایک دم اس کے دل میں یہ باتیں پیدا ہوئیں، عجیب واہیات نوکر ہیں دروازے کے عین بیچ میں یہ حقہ لگا دیا ہے میں ابھی اس دروازے سے اندر آیا ہوں، اگر ٹھوکر سے بھری ہوئی چلم گر پڑتی تو پا انداز جو کہ مونج کا بنا ہوا ہے جلنا شروع ہو جاتا اور ساتھ ہی قالین بھی۔۔۔۔

اس کے جی میں آئی کہ غلام محمد کو آواز دے جب وہ بھاگا ہوا اس کے سامنے آ جائے تو وہ بھرے ہوئے حقے کی طرف اشارہ کر کے اس سے صرف اتنا کہے "تم نرے الو کے پٹھے ہو" مگر اس نے تامل کیا اور سوچا "یوں بگڑنا اچھا معلوم نہیں ہوتا اگر غلام محمد کو اب بلا کر الو کا پٹھا کہہ بھی دیا تو وہ بات پیدا نہ ہو گی اور پھر۔۔۔۔اور پھر اس بے چارے کا کوئی قصور بھی تو نہیں ہے میں دروازے کے پاس بیٹھ کر ہی تو ہر روز حقہ پیتا ہوں۔"

چنانچہ وہ خوشی جو ایک لمحے کے لیے قاسم کے دل میں پیدا ہوئی تھی کہ اس نے الو کا پٹھا کہنے کے لیے ایک اچھا موقع تلاش کر لیا غائب ہو گئی۔

دفتر کے وقت میں ابھی کافی دیر تھی پورے دو گھنٹے پڑے تھے، دروازہ کے پاس کرسی رکھ کر قاسم اپنے معمول کے مطابق بیٹھ گیا اور حقہ نوشی میں مصروف ہو گیا۔

کچھ دیر تک وہ سوچ بچار کیے بغیر حقے کا دھواں پیتا رہا اور دھوئیں کے انتشار کو دیکھتا رہا۔ لیکن جونہی وہ حقے کو چھوڑ کر کپڑے تبدیل کرنے کے لیے ساتھ والے کمرے میں گیا تو اس کے دل میں وہی خواہش نئی تازگی کے ساتھ پیدا ہوئی۔

قاسم گھبرا گیا۔ بھئی حد ہو گئی ہے۔۔۔۔الو کا پٹھا۔۔۔۔میں کسی کو الو کا پٹھا کیوں کہوں اور بفرض محال میں نے کسی کو الو کا پٹھا کہہ بھی دیا تو کیا ہو گا۔۔۔۔

قاسم دل ہی دل میں ہنسا وہ صحیح الدماغ آدمی تھا اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ خواہش جو اس کے دل میں پیدا ہوئی ہے بالکل بیہودہ اور بے سروپا ہے لیکن اس

کا کیا علاج تھا کہ دبانے پر وہ اور بھی زیادہ ابھر آتی تھی۔

قاسم اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ بغیر کسی وجہ کے الو کا پٹھا نہ کہے گا خواہ یہ خواہش صدیوں تک اس کے دل میں تلملاتی رہے شاید اسی احساس کے باعث یہ خواہش جو بھٹکی ہوئی چمگادڑ کی طرح اس کے روشن دل میں چلی آئی تھی اس قدر تڑپ رہی تھی۔

پتلون کے بٹن بند کرتے وقت جب اس نے دماغی پریشانی کے باعث اوپر کا بٹن نچلے کاج میں داخل کر دیا تو وہ جھلا اٹھا ''بھئی کون ہوگا۔۔۔۔۔۔یہ کیا بیہودگی ہے۔۔۔۔۔دیوانہ پن نہیں تو اور کیا ہے۔۔۔۔۔الو کا پٹھا کہو۔۔۔۔۔۔الو کا پٹھا کہو اور یہ پتلون کے سارے بٹن مجھے پھر سے بند کرنے پڑیں گے'' لباس پہن کر وہ میز پر آ بیٹھا اس کی بیوی نے چائے بنا کر پیالی اس کے سامنے رکھ دی اور توس پر مکھن لگانا شروع کر دیا روزانہ معمول کی طرح ہر چیز ٹھیک ٹھاک تھی توس اتنے اچھے سنکے ہوئے تھے کہ بسکٹ کی طرح کر کرے تھے اور ڈبل روٹی بھی اعلیٰ قسم کی تھی خمیر میں سے خوشبو آ رہی تھی مکھن بھی صاف تھا چائے کی کیتلی بے داغ تھی اس کی مونھ کے ایک کونے پر قاسم ہر روز میل دیکھا کرتا تھا مگر آج وہ دھبہ بھی نہیں تھا۔

اس نے چائے کا ایک گھونٹ پیا اس کی طبیعت خوش ہو گئی، خالص دارجلنگ کی چائے تھی جس کی مہک پانی میں بھی برقرار تھی دودھ کی مقدار بھی صحیح تھی۔

قاسم نے خوش ہو کر اپنی بیوی سے کہا ''آج چائے کا رنگ بہت ہی پیارا ہے اور بڑے سلیقے سے بنائی گئی ہے۔''

بیوی تعریف سن کر خوش ہوئی مگر اس نے منہ بنا کر ایک ادا سے کہا ''جی ہاں۔۔۔بس آج اتفاق سے اچھی بن گئی ہے ورنہ ہر روز تو آپ کو نیم گھول کے پلائی جاتی ہے۔۔۔۔مجھے سلیقہ کہاں آتا ہے۔۔۔سلیقے والیاں تو وہ موئی ہوٹل کی چھوکریاں ہیں جن کے آپ ہروقت گن گایا کرتے ہیں''

یہ تقریر سن کر قاسم کی طبیعت مکدر ہوگئی ایک لمحہ کے لیے اس کے جی میں آئی کہ چائے کی پیالی میز پر الٹ دے اور وہ نیم جو اس نے اپنے بچے کی پھنسیاں دھونے کے لیے غلام محمد سے منگوائی تھی اور سامنے بڑے طاقچے میں پڑی تھی گھول کر پی لے مگر اس نے بردباری سے کام لیا ''یہ عورت میری بیوی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی بات بہت ہی بھونڈی ہے مگر ہندوستان میں سب لڑکیاں بیوی بن کر ایسی بھونڈی باتیں ہی کرتی ہیں اور بیوی بننے سے پہلے اپنے گھروں میں وہ اپنی ماؤں سے کیسی باتیں سنتی ہیں؟ بالکل ایسی ادنیٰ قسم کی باتیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ عورتوں کو عمومی زندگی میں اپنی حیثیت کی خبر ہی نہیں۔۔۔میری بیوی تو پھر بھی غنیمت ہے یعنی صرف ایک ادا کے طور پر ایسی بھونڈی بات کہہ دیتی ہے، اس کی نیت نیک ہوتی ہے بعض عورتوں کا تو یہ شعار ہوتا ہے کہ ہروقت بکواس کرتی رہتی ہیں''

یہ سوچ کر قاسم نے اپنی نگاہیں اس طاقچے سے ہٹالیں۔جس میں نیم کے پتے دھوپ میں سوکھ رہے تھے اور بات کا رخ بدل کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا'' دیکھو، آج نیم کے پانی سے بچے کی ٹانگیں ضرور دھو دینا نیم زخموں کے لیے بڑی اچھی ہوتی ہے۔۔۔''اور دیکھو، تم موسمیوں کا رس ضرور پیا کرو۔۔۔۔میں دفتر

سے لوٹتے ہوئے ایک درجن اور لے آؤں گا یہ رس تمہاری صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔

بیوی مسکرا دی ”آپ کو تو بس ہر وقت میری ہی صحت کا خیال رہتا ہے۔۔۔۔۔اچھی بھلی تو ہوں، کھاتی ہوں، پیتی ہوں، دوڑتی ہوں، بھاگتی ہوں۔۔۔۔میں نے جو آپ کے لیے بادام منگوا کے رکھے ہیں۔۔۔۔۔بھئی آج دس بیس آپ کی جیب میں ڈالے بغیر نہ رہوں گی۔۔۔۔۔لیکن دفتر میں کہیں بانٹ نہ دیجیے گا۔“

قاسم خوش ہو گیا کہ چلو موسمیوں کے رس اور باداموں نے اس کی بیوی کے مصنوعی غصے کو دور کر دیا اور یہ مرحلہ آسانی سے طے ہو گیا دراصل قاسم ایسے مرحلوں کو آسانی کے ساتھ ان طریقوں ہی سے طے کیا کرتا تھا جو اس نے پڑوس کے پرانے شوہروں سے سیکھے تھے اور اپنے گھر کے ماحول کے مطابق ان میں تھوڑا بہت ردو بدل کر لیا تھا۔

چائے سے فارغ ہو کر اس نے جب سگریٹ نکال کر سلگایا اور اٹھ کر دفتر جانے کی تیاری کرنے ہی والا تھا کہ پھر وہی خواہش نمودار ہو گئی اس مرتبہ اس نے سوچا، اگر میں کسی کو الو کا پٹھا کہہ دوں تو کیا ہرج ہے۔۔۔۔زیر لب بالکل ہولے سے کہہ دوں، الو۔۔۔۔کا۔۔۔۔پٹھا تو میرا خیال ہے کہ مجھے دلی تسکین ہو جائے گی یہ خواہش میرے سینے میں بوجھ بن کر بیٹھ گئی ہے کیوں نہ اس کو ہلکا کر دوں۔۔۔۔دفتر میں۔۔۔۔

اس کو صحن میں بچے کا کموڈ پڑا نظر آیا یوں صحن میں کموڈ رکھنا سخت بدتمیزی تھی اور

خصوصاً اس وقت جب کہ وہ ناشتہ کر چکا تھا اور خوشبودار کرکری توس اور تلے ہوئے انڈوں کا ذائقہ ابھی تک اس کے منہ میں تھا۔۔۔۔۔۔اس نے زور سے آواز دی ''غلام محمد''

قاسم کی بیوی جو ابھی تک ناشتہ کر رہی تھی بولی ''غلام محمد باہر گوشت لینے گیا ہے۔۔۔۔۔۔کوئی کام تھا آپ کو اس سے؟''

ایک سیکنڈ کے اندر اندر قاسم کے دماغ میں بہت سی باتیں آئیں ''کہہ دوں، یہ غلام محمد الو کا پٹھا ہے۔۔۔اور یہ کہہ کر جلدی سے باہر نکل جاؤں۔۔۔۔۔۔نہیں۔۔۔۔۔۔نہیں وہ خود تو موجود ہی نہیں پھر۔۔۔۔۔۔۔بالکل بیکار ہے۔۔۔۔لیکن سوال یہ ہے کہ بے چارے غلام محمد ہی کو کیوں نشانہ بنایا جائے اس کو تو میں ہر وقت الو کا پٹھا کہہ سکتا ہوں۔۔۔۔۔۔''

قاسم نے ادھ جلا سگریٹ گرا دیا اور بیوی سے کہا'' کچھ نہیں میں اس سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ دفتر میں میرا کھانا بے شک ڈیڑھ بجے لے آیا کرے۔۔۔۔۔۔تمہیں کھانا جلدی بھیجنے میں بہت تکلیف کرنا پڑتی ہے، یہ کہتے ہوئے اس نے بیوی کی طرف دیکھا۔ جو فرش پر اس کے گرائے ہوئے سگریٹ کو دیکھ رہی تھی قاسم کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ یہ سگریٹ اگر بجھ گیا اور یہاں پڑا رہا تو اس کا بچہ رینگتا رینگتا آئے گا اور اسے اٹھا کر منہ میں ڈال لے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے پیٹ میں گڑبڑ مچ جائے گی۔ قاسم نے سگریٹ کا ٹکڑا اٹھا کر غسل خانے کی موری میں پھینک دیا'' یہ بھی اچھا ہوا کہ میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر غلام محمود کو الو کا پٹھا نہیں کہہ دیا۔۔۔۔۔اس سے اگر ایک غلطی ہوئی ہے تو ابھی

ابھی مجھ سے بھی ہوئی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ میری غلطی زیادہ شدید تھی ۔۔۔۔

قاسم بڑا صحیح الدماغ آدمی تھا اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ صحیح خطوط پر غور وفکر کرنے والا انسان ہے مگر اس احساس نے اس کے اندر برتری کا خیال کبھی پیدا نہیں کیا تھا۔ یہاں پر پھر اس کی صحیح الدماغی کو دخل تھا کہ وہ احساس برتری کو اپنے اندر دبا دیا کرتا تھا۔

موری میں سگریٹ کا ٹکڑا پھینکنے کے بعد اس نے بلا ضرورت صحن میں ٹہلنا شروع کر دیا وہ دراصل کچھ دیر کے لیے بالکل خالی الذہن ہو گیا تھا۔

اس کی بیوی ناشتے کا آخری توس کھا چکی تھی قاسم کو یوں ٹہلتے دیکھ کر وہ اس کے پاس آئی اور کہنے لگی ''کیا سوچ رہے ہیں آپ؟''

قاسم چونک پڑا ''کچھ نہیں ۔۔۔۔۔۔ کچھ نہیں ۔۔۔۔۔۔ دفتر کا وقت ہو گیا کیا؟'' یہ لفظ اس کی زبان سے نکلے اور دماغ میں وہی الو کا پٹھا کہنے کی خواہش تڑپنے لگی۔

اس کے جی میں آئی کہ بیوی سے صاف صاف کہہ دے کہ یہ عجیب و غریب خواہش اس کے دل میں پیدا ہو گئی ہے جس کا سر ہے نہ پیر، بیوی ضرور ہنسے گی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس کو بیوی کا ساتھ دینا پڑے گا، چنانچہ یوں ہنسی ہنسی میں الو کا پٹھا کہنے کی خواہش اس کے دماغ سے نکل جائے گی۔ مگر اس نے غور کیا اس میں کوئی شک نہیں کہ بیوی ہنسے گی اور میں خود بھی ہنسوں گا لیکن ایسا نہ ہو کہ یہ بات مستقل مذاق بن جائے ۔۔۔ ایسا ہو سکتا ہے ۔۔۔ ہو سکتا ہے کیا، ضرور ہو جائے گا۔ اور بہت ممکن ہے کہ انجام کار ناخوشگواری پیدا ہو، چنانچہ اس نے اپنی بیوی سے کچھ

نہ کہا اور ایک لمحہ تک اس کی طرف یونہی دیکھتا رہا۔

بیوی نے بچے کا کموڈ اٹھا کر کونے میں رکھ دیا اور کہا ''آج صبح آپ کے برخوردار نے وہ ستایا ہے کہ اللہ کی پناہ ۔۔۔۔ بڑی مشکلوں کے بعد میں نے اسے کموڈ پر بٹھایا اس کی مرضی یہ تھی کہ بستر ہی کو خراب کرے ۔۔۔۔۔ آخر لڑکا کس کا ہے ۔۔۔۔؟''

قاسم کو اس قسم کی چخ پسند تھی ایسی باتوں میں وہ تیکھے مزاج کی جھلک دیکھتا تھا۔ مسکرا کر اس نے بیوی سے کہا ''لڑکا میرا ہی ہے مگر ۔۔۔۔۔ میں نے تو آج تک کبھی بستر خراب نہیں کیا یہ عادت اس کی اپنی ہوگی۔''

بیوی نے اس کی بات کا مطلب نہ سمجھا قاسم کو مطلقاً افسوس نہ ہوا، اس لیے کہ ایسی باتیں وہ صرف اپنے منہ کا ذائقہ درست کرنے کے لیے کیا کرتا تھا۔ وہ اور بھی خوش ہوا جب اس کی بیوی نے جواب نہ دیا اور خاموش ہوگئی۔

''اچھا بھئی میں اب چلتا ہوں خدا حافظ!''

یہ لفظ جو ہر روز اس کے منہ سے نکلتے تھے آج بھی اپنی پرانی آسانی کے ساتھ نکلے اور قاسم دروازہ کھول کر باہر چل دیا۔

کشمیری گیٹ سے نکل کر جب وہ نکلسن پارک کے پاس سے گزر رہا تھا تو اسے ایک ڈاڑھی والا آدمی نظر آیا۔ ایک ہاتھ میں کھلی ہوئی شلوار تھامے وہ دوسرے ہاتھ سے استنجا کر رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر قاسم کے دل میں پھر الو کا پٹھا کہنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ''لو بھئی، یہ آدمی ہے جس کو الو کا پٹھا کہہ دینا چاہیے ۔۔۔۔ یعنی جو صحیح معنوں میں الو کا پٹھا ہے ۔۔۔۔ ذرا انداز ملاحظہ

کرو۔۔۔کس انہاک سے ڈرائی کلین کیے جا رہا ہے۔۔۔۔۔جیسے کوئی بہت اہم کام سرانجام پا رہا ہے۔۔۔۔لعنت ہے۔"

لیکن قاسم صحیح الدماغ آدمی تھا اس نے تعجیل سے کام نہ لیا اور تھوڑی دیر غور کیا "میں اس فٹ پاتھ پر جا رہا ہوں اور وہ دوسرے فٹ پاتھ پر، اگر میں نے بلند آواز میں بھی اس کو الو کا پٹھا کہا تو وہ چونکے گا نہیں۔ اس لیے کہ کم بخت اپنے کام میں بہت بری طرح مصروف ہے چاہیے تو یہ کہ اس کے کان کے پاس زور سے نعرہ بلند کیا جائے اور جب وہ چونک اٹھے تو اسے بڑے شریفانہ طور پر سمجھایا جائے، قبلہ آپ الو کے پٹھے ہیں۔۔۔۔لیکن اس طرح بھی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔"

چنانچہ قاسم نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

اسی اثناء میں اس کے پیچھے سے ایک سائیکل نمودار ہوئی۔ کالج کی ایک لڑکی اس پر سوار تھی اس لیے کہ پیچھے بستہ بندھا تھا۔ آناً فاناً اس لڑکی کی ساڑھی فری وہیل کے دانتوں میں پھنسی، لڑکی نے گھبرا کر اگلے پہیے کا بریک دبایا۔ ایک دم سائیکل بے قابو ہوئی۔ اور ایک جھٹکے کے ساتھ لڑکی سائیکل سمیت سڑک پر گر پڑی۔

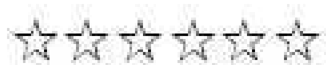
قاسم نے آگے بڑھ کر لڑکی کو اٹھانے میں عجلت سے کام نہ لیا اس لیے کہ اس نے اس حادثہ کے ردعمل پر غور کرنا شروع کر دیا تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ لڑکی کی ساڑھی فری وہیل کے دانتوں نے چبا ڈالی ہے اور اس کا بورڈ بہت بری طرح ان میں الجھ گیا ہے تو وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ لڑکی کی طرف دیکھے بغیر اس نے سائیکل کا پچھلا پہیہ ذرا اونچا اٹھایا تاکہ اسے گھما کر ساڑھی کو فری وہیل کے دانتوں میں سے نکال لے اتفاق ایسا ہوا کہ پہیہ گھمانے سے ساڑھی کچھ اس طرح تاروں

کی لپیٹ میں آئی کہ ادھر پیٹی کوٹ کی گرفت سے باہر نکل آئی قاسم بوکھلا گیا اس کی اس بوکھلاہٹ نے لڑکی کو بہت زیادہ پریشان کر دیا زور سے اس نے ساڑھی کو اپنی طرف کھینچا فری وہیل کے دانتوں میں ایک ٹکڑا اڑا رہ گیا اور ساڑھی باہر نکل آئی۔

لڑکی کا رنگ لال ہو گیا تھا قاسم کی طرف اس نے غضبناک نگاہوں سے دیکھا اور بھینچے ہوئے لہجہ میں کہا ''الو کا پٹھا''

ممکن ہے کچھ دیر لگی ہو مگر قاسم نے ایسا محسوس کیا کہ لڑکی نے جھٹ پٹ نہ جانے اپنی ساڑھی کو کیا کیا اور ایک دم سائیکل پر سوار ہو کر یہ جا وہ جا ''نظروں سے غائب ہو گئی۔''

قاسم کو لڑکی کی گالی سن کر بہت دکھ ہوا خاص کر اس لیے کہ وہ یہی گالی خود کسی کو دینا چاہتا تھا مگر وہ بہت صحیح الدماغ آدمی تھا ٹھنڈے دل سے اس نے اس حادثہ پر غور کیا اور اس لڑکی کو معاف کر دیا۔ ''اس کو معاف ہی کرنا پڑے گا۔ اس لیے کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں۔ عورتوں کو سمجھنا بہت مشکل کام ہے اور ان عورتوں کو سمجھنا تو اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جو سائیکل پر سے گری ہوئی ہوں، لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اس نے اپنی لمبی جراب میں اوپر ران کے پاس تین چار کاغذ کیوں اڑس رکھے تھے؟''



انتظار

(گھڑی آٹھ بجاتی ہے)

منتظر: آدھا گھنٹہ۔۔۔۔۔صرف آدھا گھنٹہ اور پھر اس کے بعد۔۔۔یہ ٹن کی آخری ڈوبتی ہوئی گونج کتنی پیاری تھی اور۔۔۔اور۔۔۔

منتظر کا منطقی وجود: اگر وہ نہ آئی۔۔۔یعنی اگر۔۔۔۔۔

منتظر: کیوں نہ آئے گی۔۔۔۔ضرور آئے گی (پھیکی ہنسی)۔۔۔۔۔یہ اندیشے بالکل فضول ہیں (اپنے آپ کو تسلی دینے کے انداز میں) اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔

منطقی وجود: وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا

منتظر: کتنا لغو خیال ہے۔۔۔۔کسی کے شعر کا ایک مصرعہ ہے شاید، لیکن کس قدر عامیانہ ہے۔۔۔ایسی شاعری ہی نے تو۔۔۔۔۔وہ ضرور آئے گی اور شاعری۔۔۔شاعری اچھی چیز ہے۔۔۔تپائی پر جو یہ گلدان پڑا ہے میں نے اس میں ابھی تک پھول کیوں نہ سجائے (پھولدان اٹھاتا ہے)۔۔۔۔۔۔یہ پھولدان اسے پسند ہے۔ آج وہ اسے اور بھی پسند کرے گی نرگس اور بنفشہ کے پھول اسے بہت بھاتے ہیں۔۔۔۔۔یہاں پر یہ ٹھیک رہے گا۔۔۔کیوں (پھولدان پھر وہیں رکھ دیتا ہے سیٹی بجاتا ہے)

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

(وقفہ)

منتظر: (ایک ایک لفظ کر کے) وہ ---آئیں---گھر---میں---

ہمارے---خدا---کی---قدرت---ہے---خدا کی قدرت ہے (چونک کر) خدا کی قدرت خدا کی قدرت یعنی اس کا آنا بالکل اچانک تھا شاعر کو اس کی آمد کا یقین نہیں تھا---بھئی ہو گا مگر ہمیں تو پورا یقین ہے کیوں؟

منطقی وجود: اگر---اگر---

منتظر: ہٹاؤ جی اس خیال کو---ہاں---تو میں کیا سوچ رہا تھا---سوچ کیا رہا تھا؟ سوچنے کی بات ہی کیا ہے؟ وہ ضرور آئے گی---چند منٹوں کی بات ہے۔

منطقی وجود: ایک گھنٹے میں ساٹھ منٹ ہوتے ہیں---ساٹھ

منتظر: ستائیس منٹ اور رہ گئے ہیں--صرف ستائیس---(گھڑی کی ٹک ٹک بلند ہو کر پھر اپنی اصلی حالت پر آجاتی ہے) ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی ہے پھولدان بھی سج گیا سگریٹ سلگا لیتا ہوں ایک سگریٹ کم از کم دس منٹ جلتا رہے گا۔

منطقی وجود: ساڑھے سات منٹ

منتظر: تو کیا ہوا---(سگریٹ سلگاتا ہے)

منطقی وجود: کش زور سے کیوں لے رہے ہو

منتظر: ساتھ ساتھ ٹہلتا بھی رہوں تو ٹھیک رہے گا (ٹہلتا ہے) ہاں---تو یہ

بات ہے۔

منطقی وجود: کیا بات ہے تم کھوئے کھوئے سے کیوں ہو؟

منتظر: کوئی بات نہیں، بات کیا ہوگی ایک صرف اتنا ڈر ہے کہ۔۔۔۔۔۔

منطقی وجود: موسم خراب ہے

(کڑک سی بلند ہوتی ہے)

منتظر: (گھبرا کر) یہ بجلی کی کڑک تو نہیں ہے؟

منطقی وجود: سگریٹوں کا ڈبہ جو آپ نے ابھی ابھی کھولا تھا اس کا ڈھکنا آپ کے پیر کے نیچے آ گیا ہے۔

منتظر: (ہنستا ہے) آواز بالکل بجلی کی سی پیدا ہوئی۔۔۔۔کیا ڈھکنا ہی تھا؟۔۔۔ڈھکنا ہی تھا۔۔۔۔۔(کھڑکی کھولتا ہے) موسم زیادہ خراب تو نہیں ہے بادل؟ وہ اب تو گھر سے چل پڑی ہوگی یہ سگریٹ ختم ہونے ہی میں نہیں آتا۔ انگلیوں میں مسلا گیا ہے۔

منطقی وجود: دوسرا سلگاؤ اور یوں تھوڑا سا وقت بھی خرچ ہو جائے گا

منتظر: نہیں۔۔۔۔زیادہ سگریٹ میں نہیں پیوں گا، منہ سے بو آئے گی۔ بہت ممکن ہے اسے ناگوار معلوم ہو۔۔۔۔اس نے ایک بار کہا بھی تو تھا۔۔۔

وہ: (یعنی جس کا انتظار کیا جا رہا ہے، اس کی آواز آتی ہے) تمہیں میری ہی جان کی قسم جواب سے سگریٹ پیو۔۔۔۔

منتظر: مجھے عدول حکمی نہیں کرنی چاہیے (وقفہ)

منطقی وجود: سگریٹ بجھا دیا اب یہ وقت کیسے کٹے گا

منتظر: یہ گراموفون باجا۔۔۔۔۔ریکارڈ نکال کر باہر رکھ دوں، بہت ممکن ہے وہ بجانا چاہے۔

منطقی وجود: ایک ریکارڈ پورے تین منٹ تک بجتا رہے گا

منتظر: تین منٹ۔۔۔۔۔(ریکارڈ لگاتا ہے)۔۔۔۔۔۔۔تین منٹ تک بجتا رہے گا۔کیا برا ہے۔۔۔موسیقی مجھے پسند ہے

(ریکارڈ بجاتا ہے)

رات کٹی گن گن کے تارے

(ریکارڈ پر سے ایک دم سوئی ہٹا لیتا ہے)

منتظر: کیسا واہیات ریکارڈ ہے رات کٹی گن گن کے تارے۔۔۔۔۔

منطقی وجود: ابھی تو آٹھ بج کر کچھ منٹ ہوئے ہیں ساری رات پڑی ہے۔

منتظر: ابھی آٹھ بج کر کچھ منٹ ہی ہوئے ہیں۔۔۔تو اس کا کیا مطلب ہے۔۔میں۔۔۔میں اتنا بے تاب کیوں ہو رہا ہوں۔۔۔۔آ جائے گی۔۔۔ایسی باتوں ہی سے تو ان لوگوں کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ جاتا ہے۔۔۔میں اس کا انتظار بالکل نہیں کروں گا۔۔۔کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں میز پر یہ سفید کاغذ رکھا ہی ہے۔اس پر اس مہینے کا حساب لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔۔ہاں۔۔۔سگریٹ، پانچ روپے۔۔۔سگریٹ پانچ روپے۔۔۔(یہ آواز فیڈ ہوتی جاتی ہے اور جس کا انتظار کیا جا رہا ہے اس کی آواز ابھرتی آتی ہے)

وہ: تمہیں میری جان کی قسم جواب سے سگریٹ پیو۔۔۔دیکھو تو کتنے کمزور ہو رہے ہو۔۔۔۔بادام کھایا کرو

منتظر: اے میرا کتنا خیال ہے۔۔۔۔ ابھی آ بھی جائے۔ مگر۔۔۔۔۔

منطقی وجود: ساڑھے آٹھ بجنے میں ابھی کافی دیر ہے۔

منتظر: میں سمجھتا ہوں یہ گھڑی فاسٹ ہے۔۔۔۔۔ کیا پتہ ہے کہ۔۔۔۔۔

منطقی وجود: گھڑی سلو ہو

منتظر: اجی نہیں، اس گھڑی کا وقت بالکل صحیح ہے۔۔۔۔۔۔ ابھی پرسوں ہی تو ٹھیک کرائی ہے۔۔۔ (وقفہ)۔۔۔۔۔ کہیں اس کی گھڑی میں فرق نہ ہو۔

منطقی: ایسا ہو سکتا ہے

منتظر: تو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔۔۔ پانچ نہیں دس منٹ کا فرق ہو گا

منطقی: اس وقت سے لے کر اب تک دس منٹ مشکل سے گزرے ہیں۔۔۔۔ نہیں ابھی دس منٹ نہیں گزرے۔

منتظر: تو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔۔۔۔۔۔ پانچ نہیں دس منٹ کا فرق ہو گا۔

منطقی: اس وقت سے لے کر اب تک دس منٹ مشکل سے گزرے ہیں۔۔۔۔ نہیں ابھی دس منٹ نہیں گزرے۔

منتظر: گھڑی میں ضرور خرابی ہے۔۔۔۔ کھول کر نہ دیکھ لوں

منطقی وجود: کھول کر آپ کو کیا نظر آ جائے گا

منتظر: کچھ نہیں میں نے تو یہ کہا تھا کہ چلو یوں تھوڑا سا وقت گزر جائے گا

منطقی وجود: تو چلیے پرزے کھول کر بیٹھ جائیے مگر یاد رہے اس دن کی طرح پھر جڑیں گے نہیں۔

منتظر: (ہنستا ہے) کیسے کیسے عجیب خیال آتے ہیں (ہنستا ہے پھر گاتا ہے) کیسے کیسے عجیب خیال آتے ہیں۔۔۔۔۔۔نہیں وزن ٹھیک نہیں ہے۔۔۔۔

منطقی وجود: یہ آپ کو شاعری کیا سوجھی

منتظر: (خوب ہنستا ہے) یہ شاعری بھی اچھی رہی۔۔۔۔۔۔اب آ بھی جائے۔۔۔۔وقت کیا ہوا ہے۔۔۔۔۔ساڑھے۔۔۔۔

منطقی: ابھی ساڑھے کہاں۔۔۔۔سوا کہیے سوا

منتظر: مجھے کوئی کام بھی نہیں ہے آج

منطقی: اس مہینے کا حساب لکھنا تھا

منتظر: اجی لعنت بھیجو حساب کتاب پر یہ بھی کوئی وقت ہے حساب کتاب کا۔۔۔۔لیکن ایسے وقت میں کرنا کیا چاہیے۔

منطقی: اس کو ایک خط لکھنا شروع کر دو

منتظر: بالکل ٹھیک۔۔۔۔۔۔۔۔(وقفہ)۔۔۔اس پیڈ کا کاغذ اچھا رہے گا

منطقی: ہاں۔۔۔۔۔خوشبو دار ہے

منتظر: کیا لکھوں۔۔۔۔۔(وقفہ)۔۔۔۔۔مضمون سمجھ میں نہیں آتا۔

منطقی: لکھو۔۔۔۔۔۔میں تمہارا بہت انتظار کرتا رہا

منتظر: اور جب وہ آئے تو یہ خط اس کو دے دیں۔۔۔۔خیال اچھا ہے۔۔۔تو لکھتا ہوں۔۔۔۔(وقفہ)۔۔۔میرا خیال ہے کہ اب وہ گھر سے چل پڑی ہو گی۔۔۔یہ خط اس کے آنے تک ختم نہ ہو گا۔

منطقی: تم خط لکھنا شروع تو کرو

منتظر: میری پیاری۔۔۔تم نے آج وعدہ کیا تھا کہ ساڑھے آٹھ بجے آؤ گی میں تمہارا شدت سے انتظار کرتا رہا۔۔۔۔

منطقی: کتنی پھسپھسی عبارت ہے

منتظر: پھسپھسی۔۔۔۔۔۔نہیں تو۔۔۔(وقفہ)۔۔۔واقعی پھسپھسی ہے۔۔۔اب تو وہ آتی ہی ہو گی (کاغذ پھاڑ دیتا ہے) خط کی کوئی ضرورت نہیں میں اس کو زبانی بتا دوں گا۔

منطقی: بشرطیکہ وہ آجائے

منتظر: یہ شرط کیسی۔۔۔۔۔۔وہ ضرور آئے گی

منطقی وجود: اگر۔۔۔اگر۔۔۔۔۔۔

منتظر: نہیں۔۔۔نہیں

منطقی: ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے

منتظر: کیسے بیہودہ خیال ہیں

منطقی: اگر وہ نہ آئی تو

منتظر: ضرور آئے گی

منطقی: دیکھ لیں گے

(دستک کی آواز)

منتظر: (خوش ہو کر) لو وہ آ گئی (گھبرا کر) سب چیزیں ٹھیک ہیں نا؟۔۔۔سگریٹوں کا ڈبہ؟۔۔۔اسے کہاں رکھوں؟۔۔۔کون ہے؟۔۔۔اس کا ڈھکنا کہاں ہے؟۔۔۔لعنت!۔۔خالی ہی کہیں چھپا دیتا

ہوں۔۔۔۔اور۔۔۔۔اور یہ۔۔آیا۔۔۔بس اب سب ٹھیک ٹھاک ہے۔

منطقی: اپنا دم تو درست کر لو۔۔۔۔ہانپ رہے ہو

منتظر: دم وم سب ٹھیک ہے۔۔۔۔۔۔میرا خیال ہے اس کو تھوڑا سا ڈرانا چاہیے۔

(دروازہ کھولتا ہے اور پھر ایک دم ڈرانے کی خاطر ''ہپ'' کرتا ہے)

اخبار والا: (ڈرے ہوئے انداز میں) اجی صاحب۔۔۔۔۔۔آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔۔۔۔۔۔اف

منتظر: تم۔۔۔ت۔۔و۔۔تم۔۔۔۔۔۔تم کون ہو۔۔۔تم اخبار والے کیوں ہو؟۔۔۔۔بھاگ جاؤ یہاں سے۔

اخبار والا: حضور یہ پوچھنے آیا تھا کہ دونوں اخبار اسٹیٹسمین اور ہندوستان ٹیمز لایا کروں یا اکیلا اسٹیٹسمین۔۔۔۔۔۔جیسا آپ حکم دیں۔

منتظر: جتنے بھی ہوں لے آیا کرو

اخبار والا: بہت اچھا سرکار

(اخبار والا جاتا ہے دروازہ بند کر دیا جاتا ہے)

منتظر: اس اخبار والے کو بھی اسی وقت آنا تھا۔۔۔کمبخت ڈر گیا تھا (ہنستا ہے)

(ہولے ہولے دستک دینے کی آواز)

منتظر: (ہنسی روک کر) آ گئی۔۔۔آ گئی۔۔۔۔۔

(دروازہ کھولتا ہے اور پھر ایک دم ''ہپ'' کرتا ہے)

اخبار والا: (ڈرے ہوئے انداز میں) صاحب۔۔۔یہ ۔۔۔۔۔یہ۔۔۔۔۔آپ بار بار مجھے کیوں ڈراتے ہیں۔

منتظر: اوہ۔۔۔تم کیا چاہتے ہو؟۔۔۔۔اب پھر کیوں آئے ہو؟۔۔۔۔۔خدا کے لیے جاؤ۔

اخبار والا: صاحب یہ پوچھنے آیا تھا کہ اردو کے اخبار بھی لے آیا کروں؟

منتظر: فارسی، عربی، گجراتی، مرہٹی، پنجابی، سب زبانوں کے لے آیا کرو مگر خدا کے لیے اس وقت جاؤ۔

(دروازہ بند کر دیتا ہے)

منتظر: حد ہو گئی ہے

منطقی وجود: بڑے شرم کی بات ہے وہ دل میں کیا کہتا ہوگا

منتظر: اجی ہٹاؤ۔ لیکن میں کہتا ہوں وہ ابھی تک آئی کیوں نہیں کہیں ایسا تو نہیں ہو گیا۔۔۔۔۔

منطقی وجود: کہ وہ بھول گئی ہو

منتظر: ایسا بھلا ہو سکتا ہے بس اب وہ آتی ہی ہوگی یہاں سے اس کا گھر بھی تو کافی دور ہے اور بہت ممکن ہے پیدل آئے۔

منطقی: تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ وہ بہت دیر کے بعد آئے گی

منتظر: میرا مطلب یہ تو نہیں تھا وہ گھر سے تو بہت پہلے کی چل پڑی ہو گی گھڑی۔۔۔گھڑی۔۔۔۔یہ گھڑی خراب ضرور ہو گئی ہے۔۔۔۔دیکھو نا اس کی سیکنڈ کی سوئی کتنی ہولے ہولے چلتی ہے۔

منطقی: سامنے کلاک موجود ہے

منتظر: دونوں کا وقت مجھے صحیح معلوم نہیں ہوتا۔۔۔۔۔۔خیر کل پتا لگ جائے گا۔۔۔ابھی تک دس منٹ باقی ہیں۔۔۔۔گزر کتنے چکے ہیں۔

منطقی: سترہ۔۔۔۔۔۔تیرہ ابھی باقی ہیں

منتظر: میں دیوانہ ہو جاؤں گا

منطقی: کیا کہا

منتظر: کچھ بھی نہیں۔۔۔۔۔۔تو یہ ناول پڑھنا شروع کر دیتا ہے

(لکڑی کے ساتھ کوئی چیز ٹکراتی ہے)

منتظر: (اچھل کر)۔۔۔۔۔۔لو وہ آ گئی۔۔۔۔۔آیا

منطقی: آپ کا پیر کرسی کے نچلے ڈنڈے کے ساتھ ٹکرایا ہے دستک نہیں ہوئی

منتظر: پھر ٹکرائے گا۔۔۔۔۔اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔۔۔۔۔ٹہلتا رہوں گا اور پڑھتا رہوں گا۔ (بے قراری کے ساتھ ٹہلتا ہے۔۔۔گھڑی کی ٹک ٹک کی رفتار مدھم ہو جاتی ہے مگر آواز بلند ہو جاتی ہے)

منتظر: کچھ سمجھ میں نہیں آتا عجب اوٹ پٹانگ عبارت ہے (کتاب بند کرنے اور میز پر رکھنے کی آواز)۔۔۔پھر پڑھوں گا

منطقی وجود: دل بیٹھتا کیوں جا رہا ہے

منتظر: کیا معلوم۔۔۔پانی پیتا ہوں (پانی پیتا ہے) تلخی۔۔۔کس قدر تلخی ہے حلق میں۔۔میرا خیال ہے کہ ٹھیک وقت پر آئے گی پورے ساڑھے آٹھ بجے (چونک کر) ابھی ساڑھے آٹھ نہیں بجے۔۔۔۔۔میں۔۔۔۔۔میں بیٹھ جاتا

ہوں (گھڑی بڑے بڑے وقفوں کے بعد ٹک ٹک کرتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیکنڈ لمبے ہو گئے ہیں) مجھے کچھ ہو گیا ہے

منطقی وجود: پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا

منتظر: پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا (میز پر انگلیوں سے ڈھول بجاتا ہے) یہ میں کیا کر رہا ہوں (گھڑی کی بھیانک آواز)

(اٹھ کر اضطراب کے ساتھ ٹہلنا شروع کر دیتا ہے)

منطقی وجود: پیر لڑکھڑا رہے ہیں

منتظر: تو اچھا بھلا بیٹھا تو تھا ـ ـ ـ اٹھ کر چلنے کیوں لگا ـ ـ ـ ـ ـ ـ حلق سوکھ رہا ہے لیکن اب تو اس کے آنے میں کوئی دیر نہیں چند منٹوں کی ـ ـ ـ ـ

منطقی وجود: چند منٹوں کی جن میں ـ ـ ـ ـ ـ ـ (گھڑی لمبے لمبے سانس لیتی ہے)

(کاغذ کھڑکھڑاتا ہے)

منتظر: آج ہوا کتنی تیز ہے ـ ـ ـ ـ کیلنڈر کا کاغذ کھڑکھڑا رہا ہے

(برتن گرنے کی آواز)

منتظر: اس میری ہمسائی کے گھر میں ہر وقت برتن ہی گرتے رہتے ہیں

منطقی: آج تمہارے کان بڑے تیز ہیں

فریب آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آواز پا سمجھے

منتظر: ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آواز پا سمجھے ـ ـ ـ ـ ـ آواز پا ـ ـ ـ دل

کی دھڑکن ۔۔۔(گھڑی زیادہ لمبے لمبے سانس لیتی ہے)۔۔۔۔۔یہ میرے دل کو کچھ ہو گیا ہے یا کلاک خراب ہو گیا ہے ۔۔۔میرا حلق بھی سوکھ رہا ہے ۔۔۔۔ابھی وقت نہیں ہوا (اضطراب کے ساتھ ٹہلتا ہے)

(دروازے پر دستک)

منتظر: (کمزور آواز میں)۔۔۔آ گئی ۔۔۔آ گئی ۔۔۔۔۔خوشی سے میری آواز ہی نہیں نکلتی ۔۔۔دروازہ ۔۔۔۔۔۔دروازہ ۔۔۔۔۔

منطقی: دروازہ آپ کے سامنے ہے

منتظر: ارے ہاں ۔۔۔۔آیا ۔۔۔۔۔۔آیا

(دروازہ کھولنے کی آواز)

دوست: اسلام علیکم

منتظر: (تتلا کر) وو وو ۔۔۔۔۔۔وعلیکم السلام ۔۔۔۔ک ۔۔۔۔ک ۔۔۔ک ۔۔۔کیسے تشریف لائے

دوست: میں تم کو اس گھوڑی کی بابت کچھ بتانے آیا تھا

منتظر: گھو ۔۔۔گھو ۔۔۔گھوڑی

دوست: ہاں وہی جس کی بابت کالے خاں کہتا تھا کہ بڑی دولتیاں جھاڑتی ہے بھئی تھی بڑی منہ زور ۔۔۔۔۔پٹری نہیں جمنے دیتی تھی ۔ بگدھریاں کرتی تھی بگدھریاں ۔

منتظر: بگ ۔۔دھریاں ۔۔۔۔۔جی

دوست: منہ کی بہت کڑی تھی ۔۔۔۔الف ہو جاتی تھی الف

منتظر: جی۔۔۔کسی سلوتری کے حوالے کر دی ہوتی

دوست: ہم تو گھاس کھا گئے ہو۔۔۔کہاں کا سوار کہاں کا سلوتری قدم رکاب میں گیا اور بگٹٹ ہو گئی۔۔۔۔۔۔۔اور مجھے تو پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتی تھی ایسی چمکتی تھی جیسے بجلی۔۔۔۔

منتظر: میں۔۔۔۔میں۔۔۔

دوست: کاٹھیاواڑ کھیت کی تھی نا۔۔۔۔۔چھوٹے تو سرپٹ جائے انجر پنجر ڈھیلے کر دے۔۔۔۔

منتظر: میں۔۔۔میں۔۔۔

دوست: یہ میں میں کیا کرتے ہو

منتظر: میں بیمار ہوں۔۔۔۔۔۔سخت بیمار ہوں۔۔۔۔آپ۔۔۔۔۔آپ۔۔۔۔اوہ۔۔۔ساڑھے آٹھ بجنے والے ہیں۔

دوست: (فکر مند لہجہ میں) تم بیمار ہو لیکن بھئی عجیب بیوقوف ہو مجھ سے تم نے پہلے کیوں نہ کہا۔۔۔۔اب اطمینان سے اپنا سارا حال سناؤ مجھے کوئی خدمت بتاؤ بھئی واللہ کمال کر دیا۔۔۔اور ہاں۔۔۔۔یہ ساڑھے آٹھ بجے تم نے کیا کہا تھا۔

منتظر: (مردہ آواز میں) ساڑھے آٹھ بجے۔۔۔۔۔۔ساڑھے آٹھ بجے مجھے دوا پینی ہے۔

دوست: لاؤ میں پلا دیتا ہوں۔۔۔کہاں ہے دوا۔۔۔۔۔۔ساڑھے آٹھ بجنے میں اب کون سی دیر ہے۔۔۔۔۔دوا کہاں ہے

منتظر: نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔میں خود پی لوں گا آپ تکلیف نہ

کریں ۔۔۔۔آپ ۔۔۔۔۔آپ جائیے

دوست: میں تمہیں یہاں بیمار چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں

منتظر: میں ۔۔۔میں ۔۔۔۔بیمار نہیں ہوں ۔۔۔۔۔میں ابھی ٹھیک ہو جاؤں گا آپ جائیے ۔۔۔۔۔اوہ خدا کے لیے آپ جائیے مجھے دل کا دورہ پڑ جائے گا

دوست: دل کا دورہ ۔۔۔۔۔۔بھئی اب تو میں ہر گز نہیں جاؤں گا ۔۔۔بتاؤ دوا کہاں ہے۔

منتظر: وہ میرے پاس نہیں ہے ۔۔۔آپ جائیے ۔۔۔۔خدا کے لیے جائیے

دوست: تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر میں ڈاکٹر کے پاس بھی تو نہیں جا سکتا

منتظر: کیا کہا؟ ۔۔۔۔(اضطراب بڑھتا جاتا ہے گھڑی کی آواز زیادہ لمبے لمبے سانس لیتی ہے) ۔۔۔کیا کہا؟ آپ ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں جائیں گے ۔۔۔۔۔میں ۔۔۔۔میں ۔۔۔مر جاؤں گا ۔۔۔۔۔۔خدا کے لیے ڈاکٹر کے پاس دوڑے جائیے ۔۔۔میری حالت بہت خراب ہے ۔۔۔۔میری ۔۔۔۔۔حالت ۔۔۔۔۔بہت نازک ۔۔۔۔ہے ۔۔۔۔جائیے ۔۔۔(آواز کمزور ہوتی جاتی ہے)

دوست: غش طاری ہو گیا ۔۔۔۔کیا ہوا؟ ۔۔۔ڈاکٹر؟ ۔۔۔۔کہاں ملے گا۔ڈاکٹر ۔۔۔(گھبراہٹ کے عالم میں دوڑتا جاتا ہے) اب کوئی ڈاکٹر مل جائے اس وقت (چلا جاتا ہے)

(گھڑی اصلی حالت میں ٹک ٹک کرتی ہے۔۔۔یہ آواز ڈیڑھ
سیکنڈ تک جاری رہتی ہے۔۔۔۔آخر میں کلاک میں خرخراہٹ پیدا
ہوتی ہے اور ایک ٹن کی آواز آتی ہے اس ٹن کی گونج تھوڑی دیر قائم
رہتی ہے پھر گھڑی کی ٹک ٹک بالکل بند ہو جاتی ہے اور ایک سیکنڈ تک
مکمل خاموشی طاری رہتی ہے۔۔۔۔اس خاموشی کے بعد دروازہ
کھلتا ہے اور جس کا انتظار کیا جارہا ہے وہ آتی ہے)

وہ: دیکھوتو، کس مزے سے جناب سو رہے ہیں۔گویا ان کو معلوم ہی نہیں میں آ رہی ہوں۔۔۔کافی گہری نیند سو رہے ہیں۔۔۔۔خدا جانے کہاں سے گھومتے گھامتے تھک کر آئے ہوں گے۔۔۔۔(خفگی کے ساتھ) تو مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ یہاں بن بلائے مہمانوں کی طرح کھڑی رہوں۔۔۔۔(دروازہ بند کر کے چلی جاتی ہے)



اولاد

جب زبیدہ کی شادی ہوئیت و اس کی عمر پچیس برس کی تھی اس کے ماں باپ تو یہ چاہتے تھے کہ سترہ برس کی ہوتے ہی اس کا بیاہ ہو جائے مگر کوئی مناسب و موزوں رشتہ ملتا ہی نہیں تھا اگر کسی جگہ بات طے ہونے پاتی تو کوئی ایسی مشکل پیدا ہو جاتی کہ رشتہ عملی صورت اختیار نہ کر سکتا۔

آخر جب زبیدہ پچیس برس کی ہو گئی تو اس کے باپ نے ایک رنڈوے کا رشتہ قبول کر لیا۔۔۔اس کی عمر پینتیس برس کے قریب قریب تھی، یا شاید اس سے بھی زیادہ ہو۔ صاحب روزگار تھا مارکیٹ میں کپڑے کی تھوک فروشی کی دکان تھی ہر ماہ پانچ چھ سو روپے کما لیتا تھا۔

زبیدہ بڑی فرمانبردار لڑکی تھی اس نے اپنے والدین کا فیصلہ منظور کر لیا چنانچہ شادی ہو گئی، اور وہ اپنی سسرال چلی گئی۔

اس کا خاوند جس کا نام علم الدین تھا، بہت شریف اور محبت کرنے والا ثابت ہوا۔ زبیدہ کی ہر آسائش کا خیال رکھتا تھا کپڑے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ حالانکہ دوسرے لوگ اس کے لیے ترستے تھے۔ چالیس ہزار اور تھری بی کا لٹھا، شنتوں اور دو گھوڑے کی بوسکی کے تھانوں کے تھان زبیدہ کے پاس موجود تھے۔

وہ اپنے میکے ہر ہفتے جاتی۔۔۔۔ایک دن وہ گئی تو اس نے ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی بین کرنے کی آواز سنی اندر گئی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا باپ اچانک دل کی حرکت بند ہونے کے باعث مر گیا ہے۔

اب زبیدہ کی ماں اکیلی رہ گئی تھی گھر میں سوائے ایک نوکر کے اور کوئی بھی نہیں تھا اس نے اپنے شوہر سے درخواست کی کہ وہ اسے اجازت دے کہ وہ اپنی بیوہ ماں کو اپنے پاس بلا لے۔

علم الدین نے کہا "اجازت لینے کی کیا ضرورت تھی۔۔ یہ تمہارا گھر ہے اور تمہاری ماں میری ماں۔۔۔ جاؤ انہیں لے آؤ۔۔۔۔۔۔ جو سامان وغیرہ ہو گا اس کو یہاں لانے کا بندوبست میں ابھی کیے دیتا ہوں"

زبیدہ بہت خوش ہوئی گھر کافی بڑا تھا دو تین کمرے خالی پڑے تھے وہ تانگے میں گئی اور اپنی ماں کو ساتھ لے آئی علم الدین نے سامان اٹھوانے کا بندوبست کر دیا تھا، چنانچہ وہ بھی پہنچ گیا زبیدہ کی ماں کے لیے کچھ سوچ بچار کے بعد ایک کمرہ مختص کر دیا گیا۔

وہ بہت ممنون و متشکر تھی۔ اپنے داماد کے حسن سلوک سے بہت متاثر۔ اس کے جی میں کئی مرتبہ یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اپنا سارا زیور جو کئی ہزاروں کی مالیت کا تھا، اس کو دے دے کہ وہ اپنے کاروبار میں لگائے اور زیادہ کمائے مگر وہ طبعاً کنجوس تھی۔

ایک دن اس نے اپنی بیٹی سے کہا "مجھے یہاں آئے دس مہینے ہو گئے ہیں۔۔۔۔ میں نے اپنی جیب سے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا۔۔۔ حالانکہ تمہارے مرحوم باپ کے چھوڑے ہوئے دس ہزار روپے میرے پاس موجود ہیں۔۔۔ اور زیور الگ"

زبیدہ انگیٹھی کے کوئلوں پر پھلکا سینک رہی تھی "ماں، تم بھی کیسی باتیں کرتی

ہو‘‘

’’کیسی ویسی میں نہیں جانتی۔۔۔۔میں نے یہ سب روپے علم الدین کو دے دیئے ہوتے، مگر میں چاہتی ہوں کہ تمہارے کوئی بچہ پیدا ہو۔۔۔۔تو یہ سارا روپیہ اس کو تحفے کے طور پر دوں۔‘‘

زبیدہ کی ماں کو اس بات کا بڑا خیال تھا کہ ابھی تک بچہ پیدا کیوں نہیں ہوا۔۔۔۔شادی ہوئے قریب دو برس ہو چکے تھے، مگر بچے کی پیدائش کے آثار ہی نظر نہیں آتے تھے۔

وہ اسے کئی حکیموں کے پاس لے گئی۔ کئی معجونیں، کئی سفوف، کئی قرص اس کو کھلوائے، مگر خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

آخر اس نے پیروں فقیروں سے رجوع کیا ٹونے ٹوٹکے استعمال کیے گئے۔ تعویذ دھاگے بھی۔۔۔مگر مراد بر نہ آئی زبیدہ۔۔اس دوران میں تنگ آ گئی ایک دن چنانچہ اس نے اکتا کر اپنی ماں سے کہہ دیا ’’چھوڑو اس قصے کو۔۔۔۔بچہ نہیں ہوتا تو نہ ہو۔۔۔۔‘‘

اس کی بوڑھی ماں نے منہ بسور کر کہا ’’بیٹا۔۔۔۔۔یہ بہت بڑا قصہ ہے۔۔۔۔تمہاری عقل کو معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔تم اتنا بھی نہیں سمجھتی ہو کہ اولاد کا ہونا کتنا ضروری ہے اسی سے تو انسان کی زندگی کا باغ سدا ہرا بھرا رہتا ہے۔‘‘

زبیدہ نے پھلا چنگیر میں رکھا ’’میں کیا کروں۔۔۔۔بچہ پیدا نہیں ہوتا تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔‘‘

بڑھیا نے کہا ”قصور کسی کا بھی نہیں بیٹی۔۔۔۔بس صرف ایک اللہ کی مہربانی چاہیے“

زبیدہ اللہ میاں کے حضور ہزاروں مرتبہ دعائیں مانگ چکی تھی کہ وہ اپنے فضل وکرم سے اس کی گود ہری کرے ،مگر اس کی ان دعاؤں سے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

جب اس کی ماں نے ہر روز اس سے بچے کی پیدائش کے متعلق باتیں کرنا شروع کیں ،تو اس کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ بنجر زمین ہے ،جس میں کوئی پودا اگ ہی نہیں سکتا۔

راتوں کو وہ عجیب عجیب سے خواب دیکھتی۔بڑے اوٹ پٹانگ قسم کے ،کبھی یہ دیکھتی کہ وہ لق و دق صحرا میں کھڑی ہے اس کی گود میں ایک گل گوتھنا سا بچہ ہے ،جسے وہ ہوا میں اتنے زور سے اچھالتی ہے کہ وہ آسمان تک پہنچ کر غائب ہو جاتا ہے۔

کبھی یہ دیکھتی کہ وہ اپنے بستر میں لیٹی ہے جو ننھے منے بچوں کے زندہ اور متحرک گوشت سے بنا ہے۔

ایسے خواب دیکھ دیکھ کر اس کا دل و دماغ غیر متوازن ہو گیا۔۔۔۔۔بیٹھے بیٹھے اس کے کانوں میں بچوں کے رونے کی آواز آنے لگتی ،اور وہ اپنی ماں سے کہتی ”یہ کس کا بچہ رو رہا ہے؟“

اس کی ماں نے اپنے کانوں پر زور دے کر یہ آواز سننے کی کوشش کی ،جب کچھ سنائی نہ دیا تو اس نے کہا ”کوئی بچہ رو نہیں رہا۔۔۔۔۔“

”نہیں ماں۔۔۔۔۔رو رہا ہے۔۔۔۔بلکہ رو رو کے ہلکان ہوئے جا رہا

ہے"

اس کی ماں نے کہا "یا تو میں بہری ہو گئی ہوں، یا تمہارے کان بجنے لگے ہیں"

زبیدہ خاموش ہو گئی، لیکن اس کے کنوں میں دیر تک کسی نوزائیدہ بچے کے رونے اور بلکنے کی آوازیں آتی رہیں، اور اس کو کئی بار یہ بھی محسوس ہوا کہ اس کی چھاتیوں میں دودھ اتر رہا ہے اس کا ذکر اس نے اپنی ماں سے نہ کیا لیکن جب وہ اندر اپنے کمرے میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے گئی تو اس نے قمیص اٹھا کر دیکھا کہ اس کی چھاتیاں ابھری ہوئی تھیں۔

بچے کے رونے کی آواز اس کے کانوں میں اکثر ٹپکتی رہی۔۔۔ لیکن وہ اب سمجھ گئی تھی کہ یہ سب واہمہ ہے حقیقت صرف یہ ہے کہ اوکے دل و دماغ پر مسلسل ہتھوڑے پڑتے رہے ہیں کہ اس کے بچہ کیوں نہیں ہوتا اور وہ خود بھی بڑی شدت سے وہ خلا محسوس کرتی ہے، جو کسی بیاہی عورت کی زندگی میں نہیں ہونا چاہیے۔

وہ اب بہت اداس رہنے لگی۔۔۔۔۔۔ محلے میں بچے شور مچاتے تو اس کے کان پھٹنے لگتے اس کا جی چاہتا کہ باہر نکل کر ان سب کا گلا گھونٹ ڈالے۔ اس کے شوہر علم الدین کو اولاد و لادی کوئی فکر نہیں تھی وہ اپنے بیوپار میں مگن تھا کپڑے کے بھاؤ روز بروز چڑھ رہے تھے۔ آدمی چونکہ ہشیار تھا، اس لیے اس نے کپڑے کا کافی ذخیرہ جمع کر رکھا تھا اب اس کی ماہانہ آمدن پہلے سے دوگنا ہو گئی تھی۔

مگر اس آمدن کی زیادتی سے زبیدہ کو کوئی خوشی حاصل نہیں ہوئی تھی جب اس کا شوہر نوٹوں کی گڈی اس کو دیتا، تو اسے اپنی جھولی میں ڈال کر دیر تک انہیں لوری دیتی رہتی۔۔۔ پھر وہ انہیں اٹھا کر کسی خیالی جھولنے میں بٹھا دیتی۔

ایک دن علم الدین نے دیکھا کہ وہ نوٹ جو اس نے اپنی بیوی کو لا کر دیئے تھے، دودھ کی پتیلی میں پڑے ہیں وہ بہت حیران ہوا کہ یہ کیسے یہاں پہنچ گئے چنانچہ اس نے زبیدہ سے پوچھا "یہ نوٹ دودھ کی پتیلی میں کس نے ڈالے ہیں؟"

زبیدہ نے جواب دیا "بچے بڑے شریر ہیں، یہ حرکت انہی کی ہوگی"

علم الدین بہت متحیر ہوا "لیکن یہاں بچے کہاں ہیں؟"

زبیدہ اپنے خاوند سے کہیں زیادہ متحیر ہوئی "کیا ہمارے ہاں بچے نہیں۔۔۔۔۔آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔۔۔۔ابھی سکول سے واپس آتے ہوں گے۔۔۔ان سے پوچھوں گی کہ یہ حرکت کس کی تھی۔"

علم الدین سمجھ گیا اس کی بیوی کے دماغ کا توازن قائم نہیں لیکن اس نے اپنی ساس سے اس کا ذکر نہ کیا کہ وہ بہت کمزور عورت تھی۔

وہ دل ہی دل میں زبیدہ کی دماغی حالت پر افسوس کرتا رہا مگر اس کا علاج اس کے بس میں نہیں تھا اس نے اپنے کئی دوستوں سے مشورہ لیا ان میں سے چند نے اس سے کہا کہ پاگل خانے میں داخل کرا دو۔ مگر اس کے خیال ہی سے اسے وحشت ہوتی تھی۔

اس نے دکان پر جانا چھوڑ دیا سارا وقت گھر رہتا اور زبیدہ کی دیکھ بھال کرتا، کہ مبادا وہ کسی روز کوئی خطرناک حرکت کر بیٹھے۔

اس کے گھر پر ہر وقت موجود رہنے سے زبیدہ کی حالت کسی قدر درست ہوگئی، لیکن اس کو اس بات کی بہت فکر تھی کہ دکان کا کاروبار کون چلا رہا ہے۔ کہیں وہ آدمی جس کو یہ کام سپرد کیا گیا ہے، غبن تو نہیں کر رہا۔

اس نے چنانچہ کئی مرتبہ اپنے خاوند سے کہا ''دکان پر تم کیوں نہیں جاتے؟''

علم الدین نے اس سے بڑے پیار کے ساتھ کہا ''جانم۔۔۔میں کام کر کے تھک گیا ہوں، اب تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہوں''

''مگر دکان کس کے سپرد ہے؟''

میرا نوکر ہے۔۔۔وہ سب کام کرتا ہے

''کیا ایماندار ہے؟''

''ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔۔۔۔بہت ایماندار ہے۔۔۔۔دمڑی کا حساب دیتا ہے۔۔۔۔تم کیوں فکر کرتی ہو''

زبیدہ نے بہت متفکر ہو کر کہا ''مجھے کیوں فکر نہ ہوگی بال بچے دار ہوں مجھے اپنا تو کچھ خیال نہیں لیکن ان کا تو ہے۔۔۔۔۔یہ آپ کا نوکر اگر آپ کا روپیہ مار گیا تو یہ سمجھے کہ بچوں۔۔۔۔''

علم الدین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ''زبیدہ۔۔۔۔۔۔ان کا اللہ مالک ہے ویسے میرا نوکر بہت وفادار ہے اور ایماندار ہے، تمہیں کوئی تردد نہیں کرنا چاہیے۔''

''مجھے تو کسی قسم کا تردد نہیں ہے، لیکن بعض اوقات ماں کو اپنی اولاد کے متعلق سوچنا ہی پڑتا ہے۔''

علم الدین بہت پریشان تھا کہ کیا کرے زبیدہ سارا دن اپنے خیالی بچوں کے کپڑے سیتی رہتی۔ان کی جرابیں دھوتی، ان کے لیے اونی سویٹر بنتی کئی بار اس نے اپنے خاوند سے کہہ کر مختلف سائز کی چھوٹی چھوٹی سینڈلیں منگوائیں، جن کو وہ ہر صبح پالش کرتی تھی۔

علم الدین یہ سب کچھ دیکھتا اور اس کا دل رونے لگتا۔ اور وہ سوچتا کہ شاید اس کے گناہوں کی سزا اس کو مل رہی ہے۔ یہ گناہ کیا تھے، اس کا علم، علم الدین کو نہیں تھا۔

ایک دن اس کا ایک دوست اس سے ملا جو بہت پریشان تھا علم الدین نے اس سے پریشانی کی وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا کہ اس کا ایک لڑکی سے معاشقہ ہو گیا تھا اب وہ حاملہ ہو گئی ہے اسقاط کے تمام ذرائع استعمال کیے گئے ہیں، مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ علم الدین نے اس سے کہا "دیکھو اسقاط وسقاط کی کوشش نہ کرو۔ بچہ پیدا ہونے دو"

اس کے دوست نے جسے ہونے والے بچے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، کہا "میں بچے کا کیا کروں گا؟"

"تم مجھے دے دینا"

بچہ پیدا ہونے میں کچھ دیر تھی اس دوران میں علم الدین نے اپنی بیوی زبیدہ کو یقین دلایا کہ وہ حاملہ ہے اور ایک ماہ کے بعد اس کے بچہ پیدا ہو جائے گا

زبیدہ بار بار کہتی "مجھے اب زیادہ اولاد نہیں چاہیے، پہلے ہی کیا کم ہے"

علم الدین خاموش رہتا

اس کے دوست کی داشتہ کے لڑکا پیدا ہوا، جو علم الدین نے زبیدہ کے پاس جو کہ سو رہی تھی، لٹا دیا۔۔۔ اور اسے جگا کر کہا "زبیدہ، تم کب تک بے ہوش پڑی رہو گی یہ دیکھو، تمہارے پہلو میں کیا ہے۔"

زبیدہ نے کروٹ بدلی اور دیکھا کہ اس کے ساتھ ایک ننھا منا بچہ ہاتھ پاؤں

مار رہا ہے۔ علم الدین نے اس سے کہا ''لڑکا ہے اب خدا کے فضل و کرم سے ہمارے پانچ بچے ہو گئے ہیں۔''

زبیدہ بہت خوش ہوئی ''یہ لڑکا کب پیدا ہوا؟''

''صبح سات بجے''

''اور مجھے اس کا علم ہی نہیں ۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے درد کی وجہ سے میں بے ہوش ہو گئی ہوں گی۔''

علم الدین نے کہا ''ہاں، کچھ ایسی ہی بات تھی، لیکن اللہ کے فضل و کرم سے سب ٹھیک ہو گیا۔''

دوسرے روز جب علم الدین اپنی بیوی کو دیکھنے گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ لہو لہان ہے اس کے ہاتھ میں اس کا کٹ تھروٹ استرا ہے وہ اپنی چھاتیاں کاٹ رہی ہے۔

علم الدین نے اس کے ہاتھ سے استرا چھین لیا ''یہ کیا کر رہی ہو تم؟''

زبیدہ نے اپنے پہلو میں لیٹے ہوئے بچے کی طرف دیکھا اور کہا ''ساری رات بلکتا رہا ہے، لیکن میری چھاتیوں میں دودھ نہ اترا ۔۔۔۔ لعنت ہے ایسی ۔۔۔''

اس سے آگے، وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔ خون سے لتھڑی ہوئی ایک انگلی اس نے بچے کے منہ کے ساتھ لگا دی، اور ہمیشہ کی نیند سو گئی۔

☆☆☆☆☆☆

ایکٹریس کی آنکھ

''پاپوں کی گٹھڑی'' کی شوٹنگ تمام شب ہوتی رہی تھی، رات کے تھکے ماندے ایکٹر لکڑی کے کمرے میں جو کمپنی کے ولن نے اپنے میک اپ کے لیے خاص طور پر تیار کرایا تھا اور جس میں فرصت کے وقت سب ایکٹر اور ایکٹریسیں سیٹھ کی مالی حالت پر تبصرہ کیا کرتے تھے، صوفوں اور کرسیوں پر اونگھ رہے تھے۔ اس چوبی کمرے کے ایک کونے میں میلی سی تپائی کے اوپر دس پندرہ چائے کی خالی پیالیاں اوندھی سیدھی پڑی تھیں جو شاید رات کو نیند کا غلبہ دور کرنے کے لیے ان ایکٹروں نے پی تھیں۔ ان پیالیوں پر سینکڑوں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ کمرے کے باہر ان کی بھنبھناہٹ سن کر کسی نووارد کو یہی معلوم ہوتا کہ اندر بجلی کا پنکھا چل رہا ہے۔

دراز قد ولن جو شکل وصورت سے لاہور کا کوچوان معلوم ہوتا تھا، ریشمی سوٹ میں ملبوس صوفے پر دراز تھا آنکھیں کھلی تھیں اور منہ بھی نیم وا تھا مگر وہ سو رہا تھا اسی طرح اس کے پاس ہی آرام کرسی پر ایک مونچھوں والا ادھیڑ عمر کا ایکٹر اونگھ رہا تھا۔ کھڑکی کے پاس ڈنڈے سے ٹیک لگائے ایک اور ایکٹر سونے کی کوشش میں مصروف تھا۔ کمپنی کے مکالمہ نویس یعنی منشی صاحب ہونٹوں میں بیڑی دبائے اور ٹانگیں، میک اپ ٹیبل پر رکھے، شاید وہ گیت بنانے میں مصروف تھے جو انہیں چار بجے سیٹھ صاحب کو دکھانا تھا۔

''اوئی، اوئی، اوئی ۔۔ ہائے ۔۔۔۔۔۔۔ ہائے''

دفعتاً یہ آواز باہر سے اس چوبی کمرے میں کھڑکیوں کے راستے اندر داخل ہوئی ولن صاحب جھٹ سے اٹھ بیٹھے اور اپنی آنکھیں ملنے لگے مونچھوں والے ایکٹر کے لمبے لمبے کان ایک ارتعاش کے ساتھ اس نسوانی آواز کو پہچاننے کے لیے تیار ہوئے۔ منشی صاحب نے میک اپ ٹیبل پر سے ٹانگیں اٹھالیں اور ولن صاحب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنا شروع کردیا

''اوئی، اوئی، اوئی۔۔۔۔ہائے۔۔۔۔ہائے''

اس پر ولن، منشی اور دوسرے ایکٹر جو نیم غنودگی کی حالت میں تھے چونک پڑے، سب نے کاٹھ کے اس بکس نما کمرے سے اپنی گردنیں باہر نکالیں

''ارے، کیا ہے بھئی''

''خیر تو ہے''

''کیا ہوا؟''

''اماں، یہ تو۔۔۔۔دیوی ہیں''

''کیا بات ہے! دیوی؟''

جتنے منہ اتنی باتیں۔۔۔۔کھڑکی میں سے نکلی ہوئی ہر گردن بڑے اضطراب کے ساتھ متحرک ہوئی اور ہر ایک کے منہ سے گھبراہٹ میں ہمدردی اور استفسار کے ملے جلے جذبات کا اظہار ہوا۔

''ہائے۔۔۔۔ہائے۔۔۔۔ہائے۔۔۔اوئی۔۔۔۔اوئی''

دیوی، کمپنی کی ہر دلعزیز ہیروئن کے چھوٹے سے منہ سے چیخیں نکلیں اور باہوں کو انتہائی کرب و اضطراب کے تحت ڈھیلا چھوڑ کر اس نے اپنے چپل پہنے پاؤں کو

زور زور سے اسٹوڈیو کی پتھریلی زمین پر مارتے ہوئے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

ٹھمکا ٹھمکا بوٹا سا قد، گول گول گدرایا ہوا ڈیل، کھلتی ہوئی گندمی رنگت، خوب خوب کالی کالی تیکھی بھنویں، کھلی پیشانی پر گہرا کسوم کا ٹیکا۔۔۔ بال کالے بھنورا سے جو سیدھی مانگ نکال کر پیچھے جوڑے کی صورت میں لپیٹ دے کر کنگھی کیے ہوئے تھے، ایسے معلوم ہوتے تھے، جیسے شہد کی بہت سی مکھیاں چھتے پر بیٹھی ہوئی ہیں۔

کنارے دار سفید سوتی ساڑھی میں لپٹی ہوئی، چولی گجراتی تراش کی تھی، بغیر آستینوں کے، جن میں سے جوبن پھٹا پڑتا تھا، ساڑھی بمبئی کے طرز سے بندھی تھی چاروں طرف میٹھا میٹھا جھول دیا ہوا تھا۔۔۔ گول گول کلائیاں جن میں کھلی کھلی جاپانی ریشمیں چوڑیاں کھنکھا رہی تھیں۔ ان ریشمیں چوڑیوں میں ملی ہوئی ادھر ادھر ولایتی سونے کی پتلی پتلی کنگنیاں جھم جھم کر رہی تھیں کان موزوں اور لویں بڑی خوبصورتی کے ساتھ نیچے جھکی ہوئیں، جن میرے ہیرے کے آویزے، شبنم کی دو تھراتی ہوئی بوندیں معلوم ہو رہی تھیں۔

چیختی چلاتی، اور زمین کو چپل پہنے پیروں سے کوٹتی، دیوی نے داہنی آنکھ کو ننھے سے سفید رومال کے ساتھ ملنا شروع کر دیا۔

''ہائے میری آنکھ۔۔۔ ہائے میری آنکھ۔۔۔۔۔ ہائے''

کاٹھ کے بکس سے باہر نکلی ہوئی کچھ گردنیں اندر کو ہو گئیں اور جو باہر تھیں، پھر سے ملنے لگیں۔

''آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے؟''

''یہاں کنکر بھی تو بے شمار ہیں۔۔۔۔۔ ہوا میں اڑتے پھرتے ہیں''

''یہاں جھاڑو بھی تو چھ مہینے کے بعد دی جاتی ہے''

''اندر آ جاؤ، دیوی''

''ہاں، ہاں، آؤ۔۔۔ آنکھ کو اس طرح نہ ملو''

''ارے بابا۔۔۔۔ بولا نہ تکلیف ہو جائے گی۔۔۔۔۔۔ تم اندر تو آؤ''

آنکھ ملتی ملتی، دیوی کمرے کے دروازے کی جانب بڑھی

ولن نے لپک کر تپائی سے بڑی صفائی کے ساتھ ایک رومال میں چائے کی پیالیاں سمیٹ کر میک اپ ٹیبل کے آئینے کے پیچھے چھپا دیں اور اپنی پرانی پتلون سے ٹیبل کو جھاڑ پونچھ کر صاف کر دیا۔ باقی ایکٹروں نے کرسیاں اپنی اپنی جگہ پر جما دیں اور بڑے سلیقے سے بیٹھ گئے۔ منشی صاحب نے پرانی ادھ جلی بیڑی پھینک کر جیب سے ایک سگریٹ نکال کر سلگانا شروع کر دیا۔

دیوی اندر آئی صوفے پر سے منشی صاحب اور ولن اٹھ کھڑے ہوئے منشی صاحب نے بڑھ کر کہا ''آؤ، دیوی یہاں بیٹھو''

دروازے کے پاس بڑی بڑی سیاہ و سفید مونچھوں والے بزرگ بیٹھے تھے، ان کی مونچھوں کے لٹکے اور بڑھے ہوئے بال تھرتھرائے اور انہوں نے اپنی نشست پیش کرتے ہوئے گجراتی لہجہ میں کہا ''ادھر بیٹھو''

دیوی ان کی تھرتھراتی ہوئی مونچھوں کی طرف دھیان دیئے بغیر آنکھ ملتی اور ہائے ہائے کرتی آگے بڑھ گئی ایک نوجوان نے جو ہیرو سے معلوم ہو رہے تھے اور پھنسی پھنسی قمیص پہنے ہوئے تھے، جھٹ سے ایک چوکی نما کرسی سرکا کر آگے بڑھا

دی اور دیوی نے اس پر بیٹھ کر اپنی ناک کے بانسے کو رومال سے رگڑنا شروع کر دیا۔

سب کے چہرے پر دیوی کی تکلیف کے احساس نے ایک عجیب و غریب رنگ پیدا کر دیا تھا۔ منشی صاحب کی قوت احساس چونکہ دوسرے مردوں سے زیادہ تھی، اس لیے چشمہ ہٹا کر انہوں نے اپنی آنکھ ملنا شروع کر دی تھی۔

جس نوجوان نے کرسی پیش کی تھی، اس نے جھک کر دیوی کی آنکھ کا ملاحظہ کیا اور بڑے متفکرانہ انداز میں کہا ''آنکھ کی سرخی بتارہی ہے کہ تکلیف ضرور ہے''

ان کا لہجہ پھٹا ہوا تھا آواز اتنی بلند تھی کہ کمرہ گونج اٹھا

یہ کہنا تھا کہ دیوی نے اور زور زور سے چلانا شروع کر دیا اور سفید ساڑھی میں اس کی ٹانگیں اضطراب کا بے پناہ مظاہرہ کرنے لگیں۔

ولن صاحب آگے بڑھے اور بڑی ہمدردی کے ساتھ اپنی سخت کمر جھکا کر دیوی سے پوچھا ''جلن محسوس ہوتی ہے یا چبھن''

ایک اور صاحب جو اپنے سولا ہیٹ سمیت کمرے میں ابھی ابھی تشریف لائے تھے، آگے بڑھ کے پوچھنے لگے ''پپوٹوں کے نیچے رگڑ سی تو محسوس نہیں ہوتی''

دیوی کی آنکھ سرخ ہو رہی تھی پپوٹے ملنے اور آنسوؤں کی نمی کے باعث میلے میلے نظر آ رہے تھے چتونوں میں سے لال لال ڈوروں کی جھلک چک میں سے غروب آفتاب کا سرخ سرخ منظر پیش کر رہی تھی۔ داہنی آنکھ کی پلکیں نمی کے باعث بھاری اور گھنی ہو گئی تھیں، جس سے ان کی خوبصورتی میں چار چاند لگ گئے تھے۔ باہیں ڈھیلی کر کے دیوی نے دکھتی آنکھ کی پتلی نچاتے ہوئے کہا۔

''آں۔۔۔۔بڑا تکلیف ہوتی ہے۔۔ہائے۔۔۔۔اوئی''اور پھر سے آنکھ کو گیلے رومال سے ملنا شروع کردیا۔

سیاہ وسفید مونچھوں والے صاحب نے جو کونے میں بیٹھے تھے، بلند آواز میں کہا''اس طرح آنکھ نہ رگڑو خالی پیلی کوئی اور تکلیف ہوجائے گی۔''

''ہاں، ہاں۔۔۔۔ارے، تم پھر وہی کررہی ہو''پھٹی آواز والے نوجوان نے کہا

ولن جوفوراً ہی دیوی کی آنکھ کو ٹھیک حالت میں دیکھنا چاہتے تھے، بگڑ کر بولے''تم سب بیکار باتیں بنا رہے ہو۔۔کسی سے ابھی تک یہ بھی نہیں ہوا کہ دوڑ کر ڈاکٹر کو بلا لائے۔۔۔۔اپنی آنکھ میں یہ تکلیف ہو تو پتہ چلے۔۔۔۔''یہ کہہ کر انہوں نے مڑ کر کھڑکی میں سے باہر گردن نکالی اور زور زور سے پکارنا شروع کیا۔''ارے۔۔۔۔کوئی ہے۔۔۔کوئی ہے؟ گلاب؟۔۔۔گلاب''

جب ان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی تو انہوں نے گردن اندر کو کرلی اور بڑبڑانا شروع کردیا''خدا جانے ہوٹل والے کا یہ چھوکرا کہاں غائب ہوجاتا ہے۔۔۔۔پڑا اونگھ رہا ہوگا اسٹوڈیو میں کسی تختے پر۔۔۔مردود، نابکار''پھر فوراً ہی دور اسٹوڈیو کے اس طرف گلاب کو دیکھ کر چلائے، جو انگلیوں میں چائے کی پیالیاں لٹکائے چلا آرہا تھا''ارے گلاب۔۔۔۔گلاب!''

گلاب بھاگتا ہوا آیا اور کھڑکی کے سامنے پہنچ کر ٹھہر گیا۔ولن صاحب نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں اس سے کہا''دیکھو! ایک گلاس میں پانی لاؤ۔۔۔۔جلدی سے۔۔۔بھاگو''

گلاب نے کھڑے کھڑے اندر جھانکا، دیکھنے کے لیے کہ یہ گڑ بڑ کیا ہے۔۔۔اس پر ہیرو صاحب للکارے "ارے دیکھتا کیا ہے۔۔۔لا، نا گلاس میں تھوڑا سا پانی۔۔۔۔۔۔بھاگ کے جا، بھاگ کے"

گلاب سامنے، ٹین کی چھت والے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ دیوی کی آنکھ میں چبھن اور بھی زیادہ بڑھ گئی اور اس کی بنارسی لنگڑے کی کیری ایسی ننھی منی ٹھوڑی روتے بچے کی طرح کانپنے لگی اور وہ اٹھ کر درد کی شدت سے کراہتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی دتی بٹوے سے ماچس کی ڈبیا کے برابر ایک آئینہ نکال کر اس نے اپنی دکھتی آنکھ کو دیکھنا شروع کر دیا۔ اتنے میں منشی صاحب بولے "گلاب سے کہہ دیا ہوتا۔۔۔پانی میں تھوڑی سی برف بھی ڈالتا لائے۔"

"ہاں، ہاں، سرد پانی اچھا رہے گا" یہ کہہ کر ولن صاحب کھڑکی میں سے گردن باہر نکال کر چلائے "گلاب۔۔۔۔ارے گلاب۔۔پانی میں تھوڑی سی برف چھوڑ کے لانا"

اس دوران میں ہیرو صاحب جو کچھ سوچ رہے تھے، کہنے لگے "میں بولتا ہوں کہ رومال کو سانس کی بھانپ سے گرم کرو اور اس سے آنکھ کو سینک دو۔۔۔۔کیوں دادا؟"

"ایک دم ٹھیک رہے گا" سیاہ و سفید مونچھوں والے صاحب نے سر کو اثبات میں بڑے زور سے ہلاتے ہوئے کہا۔

ہیرو صاحب کھونٹیوں کی طرف بڑھے۔ اپنے کوٹ میں سے ایک سفید رومال نکال کر دیوی کو سانس کے ذریعے سے اس کو گرم کرنے کی ترکیب بتائی اور الگ ہو

کر کھڑے ہو گئے۔ دیوی نے رومال لے لیا اور اسے منہ کے پاس لے جا کر گال پھلا پھلا کر سانس کی گرمی پہنچائی، آنکھ کو ٹکور دی مگر کچھ افاقہ نہیں ہوا۔

"کچھ آرام آیا؟" سولا ہیٹ والے صاحب نے دریافت کیا

دیوی نے رونی آواز میں جواب دیا "نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔ابھی نہیں نکلا۔۔۔۔۔میں مر گئی!۔۔۔۔۔"

اتنے میں گلاب پانی کا گلاس لے کر آ گیا۔ ہیرو اور ولن دوڑ کر بڑھے اور دونوں نے مل کر دیوی کی آنکھ میں پانی چوایا جب گلاس کا پانی آنکھ کو غسل دینے میں ختم ہو گیا تو دیوی پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اور آنکھ جھپکانے لگی۔

"کچھ افاقہ ہوا"

"اب تکلیف تو نہیں ہے؟"

"کنکری نکل گئی ہو گی"

"بس تھوڑی دیر کے بعد آرام آ جائے گا"

آنکھ دھل جانے پر پانی کی ٹھنڈک نے تھوڑی دیر کے لیے دیوی کی آنکھ میں چبھن رفع کر دی مگر فوراً ہی پھر سے اس نے درد کے مارے چلانا شروع کر دیا۔

"کیا بات ہے؟" یہ کہتے ہوئے ایک صاحب باہر سے اندر آئے اور دروازے کے قریب کھڑے ہو کر معاملے کی اہمیت کو سمجھنا شروع کر دیا۔

نووارد کہنہ سال ہونے کے باوجود چست و چالاک معلوم ہوتے تھے مونچھیں سفید تھیں جو بیڑی کے دھوئیں کے باعث سیاہی مائل زرد رنگت اختیار کر چکی تھیں ان کے کھڑے ہونے کا انداز بتا رہا تھا کہ فوج میں رہ چکے ہیں۔

سیاہ رنگ کی ٹوپی سر پر ذرا اس طرف ترچھی پہنے ہوئے تھے پتلون اور کوٹ کا کپڑا معمولی اور خاکستری رنگ کا تھا کولہوں اور رانوں کے اوپر پتلون میں پڑے ہوئے جھول اس بات پر چغلیاں کھا رہے تھے کہ ان کی ٹانگوں پر گوشت بہت کم ہے۔ کالر میں بندھی ہوئی میلی نکٹائی کچھ اس طرح نیچے لٹک رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا وہ ان سے روٹھی ہوئی ہے۔ پتلون کا کپڑا گھٹنوں پر سے کھچ کر آگے بڑھا ہوا تھا، جو یہ بتا رہا تھا کہ وہ اس بے جان چیز سے بہت کڑا کام لیتے رہے ہیں۔ گال بڑھاپے کے باعث پچکے ہوئے آنکھیں ذرا اندر کو دھنسی ہوئیں، جو بار بار شانوں کی عجیب جنبش کے ساتھ سکیڑ لی جاتی تھیں۔

آپ نے کاندھوں کو جنبش دی اور ایک قدم آگے بڑھ کر کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے پوچھا ''کنکر پڑ گیا ہے کیا؟'' اور اثبات میں جواب پا کر دیوی کی طرف بڑھے ہیرو اور ولن کو ایک طرف ہٹنے کا اشارہ کر کے آپ نے کہا ''پانی سے آرام نہیں آیا۔۔۔۔۔ خیر۔۔۔۔۔ رومال ہے کسی کے پاس؟''

نصف درجن رومال ان کے ہاتھ میں دے دیئے گئے بڑے ڈرامائی انداز میں آپ نے ان پیش کردہ رومالوں میں سے ایک منتخب کیا، اور اس کا ایک کنارا پکڑ کر دیوی کو آنکھ پر سے ہاتھ ہٹا لینے کا حکم دیا۔

جب دیوی نے ان کے حکم کی تعمیل کی تو انہوں نے جیب میں سے مداری کے سے انداز میں ایک چرمی بٹوا نکالا اور اس میں سے اپنا چشمہ نکال کر کمال احتیاط سے ناک پر چڑھا لیا۔ پھر چشمے کے شیشوں میں سے دیوی کی آنکھ کا دور ہی سے اکڑ کر معائنہ کیا پھر دفعتاً فوٹو گرافر کی سی پھرتی دکھاتے ہوئے آپ نے اپنی ٹانگیں

چوڑی کیں اور جب انہوں نے اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے دیوی کے پپوٹوں کو وا کرنا چاہا تو ایسا معلوم ہوا کہ وہ فوٹو لیتے وقت کیمرے کا لینس بند کر رہے ہیں۔

دو تین مرتبہ ڈرامائی انداز سے اپنے کھڑے ہونے کا رخ بدل کر انہوں نے دیوی کی آنکھ کا معائنہ کیا اور پھر پپوٹے کھول کر بڑی آہستگی سے رومال کا کنارہ ان کے اندر داخل کر دیا۔۔۔ حاضرین خاموشی سے اس عمل کو دیکھتے رہے۔

پانچ منٹ تک کمرے میں قبر کی سی خاموشی طاری رہی۔ آنکھ صاف کرنے کے بعد اسی ڈرامائی انداز میں فوٹو گرافر صاحب نے۔۔۔۔ چونکہ وہ بزرگ فوٹو گرافر ہی تھے۔ چشمہ اتار کر چرمی بٹوے میں رکھ کر دیوی سے کہا ''اب کنکر نکل گیا ہے۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر میں آرام آ جائے گا۔''

دیوی نے انگلیوں سے آنکھ کے پپوٹوں کو چھوا اور ننھا سا آئینہ نکال کر اپنا اطمینان کرنے لگی۔

''کنکری نکل گئی نا؟''

''اب درد محسوس تو نہیں ہوتا''

''سالا، اب نکل گیا ہوگا۔۔۔۔۔۔ بہت دکھ دیا ہے اس نے''

''دیوی۔۔۔۔۔۔ اب طبیعت کیسی ہے؟''

یہ شور سن کر فوٹو گرافر صاحب نے کاندھوں کو زور سے جنبش دی اور کہا ''تم سارا دن کوشش کرتے رہتے مگر کچھ نہ ہوتا۔۔۔۔۔ ہم فوج میں پچیس برس بھاڑ نہیں جھونکتا رہا۔۔۔ یہ سب کام جانتا ہے۔۔۔۔۔ کنکر نکل گیا ہے، اب صرف جلن باقی ہے وہ بھی دور ہو جائے گی۔''

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دیوی جو آئینے میں رونی صورت بنائے اپنا اطمینان کر رہی تھی ایکا ایکی مسکرائی اور پھر کھل کھلا کر ہنس دی۔۔۔۔چوبی کمرے میں مترنم تارے بکھر گئے۔

"اب آرام ہے۔۔۔۔۔۔اب آرام ہے" یہ کہہ کر دیوی، سیٹھ کی جانب روانہ ہوگئی، جو ہوٹل کے پاس اکیلا کھڑا تھا، اور سب لوگ دیکھتے رہ گئے۔

ہیرو جب صوفے پر بیٹھنے لگا تو منشی صاحب کی ران نیچے دب گئی آپ بھنا گئے

"اب کیا پھر سونے کا ارادہ ہے۔۔۔۔۔چلو بیٹھو، مجھے کل والے سین کے ڈائیلاگ سناؤ"

ہیرو کے دماغ میں اس وقت کوئی اور ہی سین تھا۔

☆☆☆☆☆☆

بانجھ

میری اور اس کی ملاقات آج سے ٹھیک دو برس پہلے اپولو بندر پر ہوئی شام کا وقت تھا سورج کی آخری کرنیں سمندر کی ان دور دراز لہروں کے پیچھے غائب ہو چکی تھیں جو ساحل کے بنچ پر بیٹھ کر دیکھنے سے موٹے کپڑے کی تہیں معلوم ہوتی تھیں میں گیٹ آف انڈیا کے اس طرف پہلا بنچ چھوڑ کر جس پر ایک آدمی چمپی والے سے اپنے سر کی مالش کرا رہا تھا دوسرے بنچ پر بیٹھا تھا اور حد نظر پھیلے ہوئے سمندر کو دیکھ رہا تھا دور بہت دور، جہاں سمندر اور آسمان گھل مل رہے تھے۔ بڑی بڑی لہریں آہستہ آہستہ اٹھ رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بہت بڑا گدلے رنگ کا قالین ہے، جسے ادھر سے ادھر سمیٹا جا رہا ہے۔

ساحل کے سب قمقمے روشن تھے۔ جن کا عکس کنارے کے لرزاں پانی پر کپکپاتی ہوئی موٹی موٹی لکیروں کی صورت میں جگہ جگہ رینگ رہا تھا۔ میرے پاس پتھریلی دیوار کے نیچے کئی کشتیوں کے لپٹے ہوئے بادبان اور بانس ہولے ہولے حرکت کر رہے تھے سمندر کی لہروں اور تماشائیوں کی آواز ایک گنگناہٹ بن کر فضا میں گھلی ہوئی تھی کبھی کبھی کسی آنے یا جانے والی موٹر کے ہارن کی آواز بلند ہوتی اور یوں معلوم ہوتا کہ بڑی دلچسپ کہانی سننے کے دوران میں کسی نے زور سے ''ہوں'' کی ہے۔

ایسے ماحول میں سگریٹ پینے کا بہت مزہ آتا ہے میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کی ڈبیا نکالی مگر ماچس نہ ملی جانے کہاں بھول آیا تھا سگریٹ کی ڈبیا

واپس جیب میں رکھنے ہی والا تھا کہ پاس سے کسی نے کہا

''ماچس لیجئے گا''

میں نے مڑ کر دیکھا بنچ کے پیچھے ایک نوجوان کھڑا تھا یوں تو بمبئی کے عام باشندوں کا رنگ زرد ہوتا ہے لیکن اس کا چہرہ خوفناک طور پر زرد تھا میں نے اس کا شکریہ ادا کیا ''آپ کی بڑی عنایت ہے''

یہ سن کر اس نے ماچس کی ڈبیا جو اس کے ہاتھ ہی میں تھی میری طرف بڑھا دی میں نے پھر شکریہ ادا کیا اور کہا ''تشریف رکھیے''

اس نے جواب دیا ''آپ سگریٹ سلگا لیجئے، مجھے جانا ہے''

مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس نے جھوٹ بولا ہے کیونکہ اس کے لہجے سے اس بات کا پتہ چلتا تھا کہ اسے کوئی جلدی نہیں ہے اور نہ اسے کہیں جانا ہے آپ کہیں گے کہ لہجے سے ایسی باتوں کا پتہ کیسے چل سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس وقت ایسا ہی محسوس ہوا چنانچہ میں نے ایک بار پھر کہا'' ایسی جلدی کیا ہے۔۔۔۔تشریف رکھیے'' اور یہ کہہ کر میں نے سگریٹ کی ڈبیا اس کی طرف بڑھا دی ''شوق فرمائیے''

اس نے سگریٹ کے چھاپ کی طرف دیکھا اور جواب دیا ''شکریہ میں صرف اپنا برانڈ پیا کرتا ہوں''

آپ مانیں نہ مانیں مگر میں قسمیہ کہتا ہوں کہ اس بار اس نے پھر جھوٹ بولا اس مرتبہ پھر اس کے لہجے نے چغلی کھائی اور مجھے اس سے دلچسپی پیدا ہوگئی اس لیے کہ میں نے اپنے دل میں قصد کر لیا تھا کہ اسے ضرور اپنے پاس بٹھاؤں گا اور اپنا

سگریٹ پلواؤں گا میرے خیال کے مطابق اس میں مشکل کی کوئی بات ہی نہ تھی کیونکہ اس کے دو جملوں ہی نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہے اس کا جی چاہتا ہے کہ میرے پاس بیٹھے اور سگریٹ پئے لیکن بیک وقت اس کے دل میں یہ خیال بھی پیدا ہوتا ہے کہ میرے پاس نہ بیٹھے اور میرا سگریٹ نہ پئے چنانچہ ہاں اور نہ کا یہ تصادم اس کے لہجے میں صاف طور پر مجھے نظر آیا تھا آپ یقین جانئے کہ اس کا وجود بھی ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں لٹکا ہوا تھا۔

اس کا چہرہ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں بے حد پتلا تھا اس پر اس کی ناک آنکھوں اور منہ کے خطوط اس قدر مدھم تھے جیسے کسی نے تصویر بنائی ہے اور اس کو پانی سے دھو ڈالا ہے کبھی کبھی اس کی طرف دیکھتے دیکھتے اس کے ہونٹ ابھر سے آتے لیکن پھر راکھ میں لپٹی ہوئی چنگاری کی مانند سو جاتے۔ اس کے چہرے کے دوسرے خطوط کا بھی یہی حال تھا آنکھیں گدلے پانی کی دو بڑی بڑی بوندیں تھیں جن پر اس کی چھدری پلکیں جھکی ہوئی تھیں بال کالے تھے مگر ان کی سیاہی جلے ہوئے کاغذ کی مانند تھی جن میں بھوسلا پن بھی ہوتا ہے قریب سے دیکھنے پر اس کی ناک کا صحیح نقشہ معلوم ہو سکتا تھا مگر دور سے دیکھنے پر وہ بالکل چپٹی معلوم ہوتی تھی کیونکہ جیسا کہ میں اس سے پیشتر بیان کر چکا ہوں اس کے چہرے کے خطوط بالکل ہی مدھم تھے۔

اس کا قد عام لوگوں جتنا تھا یعنی نہ چھوٹا نہ بڑا البتہ جب وہ ایک خاص انداز سے یعنی اپنی کمر کی ہڈی کو ڈھیلا چھوڑ کے کھڑا ہوتا تو اس کے قد میں نمایاں فرق پیدا ہو جاتا اس طرح جب وہ ایک دم کھڑا ہوتا تو اس کا قد جسم کے مقابلے میں

بہت بڑا دکھائی دیتا۔

کپڑے اس کے خستہ حالت میں تھے لیکن میلے نہیں تھے کوٹ کی آستینوں کے آخری حصے کثرت استعمال کے باعث گھس گئے تھے اور پھوسڑے نکل آئے تھے کالر کھلا تھا اور قمیض بس ایک اور دھلائی کی مار تھی مگر ان کپڑوں میں بھی وہ خود کو ایک باوقار انداز میں پیش کرنے کی سعی کر رہا تھا میں نے سعی کر رہا تھا اس لیے کہا کیونکہ جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے سارے وجود میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی اور مجھے ایسا معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنے آپ کو میری نگاہوں سے اوجھل رکھنا چاہتا ہے۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور سگریٹ سلگا کر اس کی طرف پھر ڈبیا بڑھا دی ''شوق فرمایئے''

یہ میں نے کچھ اس طریقے سے کہا اور فوراً ہی ماچس سلگا کر اس انداز سے پیش کی کہ وہ سب کچھ بھول گیا۔ اس نے ڈبیا میں سے سگریٹ نکال کر منہ میں دبا لیا اور اسے سلگا کر پینا بھی شروع کر دیا لیکن ایکا ایکی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور منہ میں سے سگریٹ نکال کر مصنوعی کھانسی کے آثار حلق میں پیدا کرتے ہوئے اس نے کہا '' کیونڈر مجھے راس نہیں آتے ان کا تمباکو بہت تیز ہے میرے گلے میں فوراً خراشیں پیدا ہو جاتی ہیں''

میں نے اس سے پوچھا '' آپ کون سے سگریٹ پسند کرتے ہیں؟''

اس نے تتلا کر جواب دیا '' میں۔۔۔ میں۔۔۔ میں دراصل سگریٹ بہت کم پیتا ہوں کیونکہ ڈاکٹر ارولکر نے منع کر رکھا ہے ویسے میں تھری فائیو پیتا ہوں جن کا

تمباکو تیز نہیں ہوتا۔"

اس نے جس ڈاکٹر کا نام لیا وہ بمبئی کا بہت بڑا ڈاکٹر ہے اس کی فیس دس روپے ہے جن سگرٹوں کا اس نے حوالہ دیا ان کے متعلق آپ کو بھی معلوم ہوگا کہ بہت مہنگے داموں پر ملتے ہیں اس نے ایک ہی سانس میں دو جھوٹ بولے جو مجھے ہضم نہ ہوئے مگر میں خاموش رہا حالانکہ سچ عرض کرتا ہوں اس وقت میرے دل میں یہی خواہش چٹکیاں لے رہی تھی کہ اس کا غلاف اتار دوں اور اس کی دروغ گوئی کو بے نقاب کر دوں اور اسے کچھ اس طرح شرمندہ کروں کہ وہ مجھ سے معافی مانگے مگر میں نے جب اس کی طرف دیکھا تو اس فیصلے پر پہنچا کہ اس نے جو کچھ کہا ہے اس کا جز بن کر رہ گیا ہے جھوٹ بول کر چہرے پر جو ایک سرخی سی دوڑ جایا کرتی ہے مجھے نظر نہ آئی بلکہ میں نے دیکھا کہ وہ جو کچھ کہہ چکا ہے اس کو حقیقت سمجھتا ہے اس کے جھوٹ میں اس قدر اخلاص تھا یعنی اس نے اتنے پر خلوص طریقے پر جھوٹ بولا تھا کہ اس کی میزان احساس میں ہلکی سی جنبش بھی پیدا نہیں ہوئی تھی خیر اس قصے کو چھوڑیئے ایسی باریکیاں میں آپ کو بتانے لگوں تو صفحوں کے صفحے کالے ہو جائیں گے اور افسانہ بہت خشک ہو جائے گا۔

تھوڑی سی رسمی گفتگو کے بعد میں نے اس کو راہ پر لگا لیا اور ایک اور سگریٹ پیش کر کے سمندر کے دلفریب منظر کی بات چھیڑ دی چونکہ افسانہ نگار ہوں اس لیے کچھ اس دلچسپ طریقے پر اسے سمندر، اپولو بندر اور وہاں آنے جانے والے تماشائیوں کے بارے میں چند باتیں سنائیں کہ چھ سگریٹ پینے پر بھی اس کے حلق میں خرخراہٹ پیدا نہ ہوئی اس نے میرا نام پوچھا میں نے بتایا تو وہ اٹھ کھڑا

ہوا اور کہنے لگا ''آپ۔۔۔آپ مسٹر۔۔۔ہیں۔۔۔میں آپ کے کئی افسانے پڑھ چکا ہوں مجھے۔۔۔مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ ہی۔۔۔ہیں۔۔۔مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی واللہ بہت خوشی ہوئی ہے۔''

میں نے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہا مگر اس نے اپنی بات شروع کر دی ''ہاں خوب یاد آیا ابھی حال ہی میں آپ کا ایک افسانہ میں نے پڑھا ہے۔۔۔عنوان بھول گیا ہوں۔۔۔اس میں آپ نے ایک لڑکی پیش کی ہے جو کسی مرد سے محبت کرتی تھی مگر وہ اسے دھوکا دے گیا اس لڑکی سے ایک اور مرد بھی محبت کرتا تھا جو افسانہ سناتا ہے جب اس کو لڑکی کی افتاد کا پتہ چلتا ہے تو وہ اس سے ملتا ہے اور اس سے کہتا ہے زندہ رہو۔۔۔ان چند گھڑیوں کی یاد میں اپنی زندگی کی بنیادیں کھڑی کرو جو تم نے اس کی محبت میں گزاری ہیں اس مسرت کی یاد میں جو تم نے چند لمحات کے لیے حاصل کی تھی'' مجھے اصل عبارت یاد نہیں رہی لیکن مجھے بتائیے کیا ایسا ممکن ہے۔۔۔ممکن کو چھوڑیئے آپ یہ بتائیے کہ وہ آدمی کیا آپ تو نہیں تھے؟۔۔۔معاف کیجئے گا میں ایسے سوال کر رہا ہوں جو مجھے نہیں کرنے چاہئیں۔۔۔مگر کیا آپ ہی نے اس سے کوٹھے پر ملاقات کی تھی اور اس کی تھکی ہوئی جوانی کو اونگھتی ہوئی چاندنی میں چھوڑ کر نیچے اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلے آئے تھے۔۔۔یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم ٹھہر گیا ''مگر مجھے ایسی باتیں نہیں پوچھنی چاہئیں۔۔۔اپنے دل کا حال کون بتاتا ہے۔''

اس پر میں نے کہا ''میں آپ کو بتاؤں گا۔۔۔لیکن پہلی ملاقات میں سب

کچھ پوچھ لینا اور سب کچھ بتانا اچھا معلوم نہیں ہوتا آپ کا کیا خیال ہے؟'' وہ جوش جو گفتگو کرتے وقت اس کے اندر پیدا ہو گیا تھا ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا اس نے دھیمے لہجے میں کہا ''آپ کا فرمانا بالکل درست ہے مگر کیا پتہ ہے کہ آپ سے پھر کبھی ملاقات نہ ہو''

اس پر میں نے کہا ''اس میں شک نہیں بمبئی بہت بڑا شہر ہے لیکن ہماری ایک نہیں، بہت سی ملاقاتیں ہو سکتی ہیں بیکار آدمی ہوں یعنی افسانہ نگار۔۔۔۔شام کو ہر روز اسی وقت بشرطیکہ بیمار نہ ہو جاؤں آپ مجھے ہمیشہ اسی جگہ پر پائیں گے۔۔۔۔یہاں بے شمار لڑکیاں سیر کو آتی ہیں اور میں اس لیے آتا ہوں کہ خود کو کسی کی محبت میں گرفتار کر سکوں۔۔۔۔۔محبت بری چیز نہیں ہے۔''

''محبت۔۔۔۔محبت۔۔۔!'' اس نے اس سے آگے کچھ کہنا چاہا مگر نہ کہہ سکا اور جلتی ہوئی رسی کی طرح آخری بل کھا کر خاموش ہو گیا۔

میں نے ازراہ مذاق اس سے محبت کا ذکر کیا تھا دراصل اس وقت فضا ایسی دلفریب تھی کہ اگر میں کسی عورت پر عاشق ہو جاتا تو مجھے افسوس نہ ہوتا۔ جب دونوں وقت آپس میں مل رہے ہوں نیم تاریکی میں بجلی کے قمقمے قطار کے اندر آنکھیں جھپکنا شروع کر دیں ہوا میں خنکی پیدا ہو جائے اور فضا پر ایک افسانوی کیفیت سی چھا جائے تو کسی اجنبی عورت کے قربت کی ضرورت محسوس ہوا کرتی ہے ایک ایسی ضرورت جس کا احساس تحت شعور ہی میں چھپا رہتا ہے۔

خدا معلوم اس نے کس افسانے کے متعلق مجھ سے پوچھا تھا مجھے اپنے سب افسانے یاد نہیں اور خاص طور پر وہ تو بالکل یاد نہیں جو رومانی ہیں میں اپنی زندگی میں

بہت کم عورتوں سے ملا ہوں وہ افسانے جو میں نے عورتوں کے متعلق لکھے ہیں یا تو کسی خاص ضرورت کے ماتحت لکھے ہیں یا محض دماغی عیاشی کے لیے میرے ایسے افسانوں میں چونکہ خلوص نہیں ہے اس لیے میں نے کبھی ان کے متعلق غور نہیں کیا ایک خاص طبقے کی عورتیں میری نظر سے گزری ہیں اور ان کے متعلق ہیں میں نے چند افسانے لکھے ہیں مگر وہ رومان نہیں ہیں اس نے جس افسانے کا ذکر کیا تھا وہ یقیناً کوئی ادنیٰ درجے کا رومان تھا جو میں نے اپنے چند جذبات کی پیاس بجھانے کے لیے لکھا ہو گا۔۔۔۔لیکن میں نے تو اپنا افسانہ بیان کرنا شروع کر دیا۔

ہاں، تو جب وہ محبت کہہ کر خاموش ہو گیا تو میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ محبت کے بارے میں کچھ اور کہوں چنانچہ میں نے کہنا شروع کیا، ''محبت کی یوں تو بہت سی قسمیں ہمارے باپ دادا بیان کر گئے ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ محبت خواہ ملتان میں پیدا ہو یا سائبیریا کے یخ بستہ میدانوں میں، سردیوں میں پیدا ہو، یا گرمیوں میں، امیر کے دل میں پیدا ہو یا غریب کے دل میں۔۔۔۔محبت خوب صورت کریں یا بد صورت، بد کردار کرے یا نیکو کار۔۔۔۔محبت محبت ہی رہتی ہے اس میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔جس طرح بچے پیدا ہونے کی صورت ہمیشہ ایک سی چلی آ رہی ہے اسی طرح محبت کی پیدائش بھی ایک ہی طریقے پر ہوتی ہے یہ جدا بات ہے کہ سعیدہ بیگم ہسپتال میں بچہ جنے اور راجکماری جنگل میں غلام محمد کے دل میں بھنگن محبت پیدا کر دے اور نتھو رلال کے دل میں کوئی رانی جس طرح بعض بچے وقت سے پہلے پیدا ہوتے ہیں اور کمزور رہتے ہیں اسی طرح محبت بھی کمزور رہتی ہے جو وقت سے پہلے جنم لے بعض دفعہ بچے بڑی تکلیف سے پیدا ہوتے ہیں

بعض دفعہ محبت بھی بڑی تکلیف دے کر پیدا ہوتی ہے جس طرح عورت کا حمل گر جاتا ہے اسی طرح محبت بھی گر جاتی ہے بعض دفعہ بانجھ پن پیدا ہو جاتا ہے، ادھر بھی آپ کو ایسے آدمی نظر آئیں گے جو محبت کرنے کے معاملے میں بانجھ ہیں ۔۔۔۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ محبت کرنے کی خواہش ان کے دل سے ہمیشہ کے لیے مٹ جاتی ہے یا ان کے اندر وہ جذبہ ہی نہیں رہتا نہیں، یہ خواہش ان کے دل میں موجود ہوتی ہے مگر وہ اس قابل نہیں رہتے کہ محبت کر سکیں جس طرح عورت اپنے جسمانی نقائص کے باعث بچے پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتی اسی طرح یہ لوگ چند روحانی نقائص کی وجہ سے کسی کے دل میں محبت پیدا کرنے کی قوت نہیں رکھتے ۔۔۔۔محبت کا اسقاط بھی ہو سکتا ہے۔۔۔۔''

مجھے اپنی گفتگو دلچسپ معلوم ہو رہی تھی چنانچہ میں اس کی طرف دیکھے بغیر لکچر دیئے چلا جا رہا تھا لیکن جب میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ دور سمندر کے اس پار خلا میں دیکھ رہا تھا اور اپنے خیالات میں گم تھا میں خاموش ہو گیا۔

جب زور سے کسی موٹر کا ہارن بجا تو وہ چونکا اور خالی الذہن ہو کر کہنے لگا'' جی ۔۔۔۔۔آپ نے بالکل درست فرمایا ہے!''

میرے جی میں آئی کہ اس سے پوچھوں۔۔۔۔'' درست فرمایا ہے؟۔۔۔۔اس کو چھوڑیئے آپ یہ بتایئے کہ میں نے کہا کیا ہے؟'' لیکن میں خاموش رہا اور اس کو موقع دیا کہ اپنے وزنی خیالات دماغ سے جھٹک دے

وہ کچھ دیر سوچتا رہا اس کے بعد اس نے پھر کہا'' آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا ہے لیکن ۔۔۔۔خیر چھوڑیئے اس قصے کو''

مجھے اپنی گفتگو بہت اچھی معلوم ہوئی تھی میں چاہتا تھا کہ کوئی میری باتیں سنتا چلا جائے۔ چنانچہ میں نے پھر سے کہنا شروع کیا "تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ بعض آدمی بھی محبت کے معاملے میں بانجھ ہوتے ہیں یعنی ان کے دل میں محبت کرنے کی خواہش تو موجود ہوتی ہے لیکن ان کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوتی میں سمجھتا ہوں کہ اس بانجھ پن کا باعث روحانی نقائص ہیں آپ کا کیا خیال ہے؟"

اس کا رنگ اور بھی زرد پڑ گیا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو یہ تبدیلی اس کے اندر اتنی جلدی پیدا ہوئی کہ میں نے گھبرا کر اس سے پوچھا "خیریت تو ہے۔۔۔آپ بیمار ہیں"

"نہیں تو۔۔۔۔نہیں تو۔۔۔۔" اس کی پریشانی اور بھی زیادہ ہو گئی۔۔۔" مجھے کوئی بیماری ویماری نہیں ہے۔۔۔لیکن آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں بیمار ہوں"

میں نے جواب دیا "اس وقت آپ کو جو کوئی بھی دیکھے گا یہی کہے گا کہ آپ بہت بیمار ہیں آپ کا رنگ خوفناک طور پر زرد ہو رہا ہے۔۔۔میرا خیال ہے کہ آپ کو گھر چلے جانا چاہیے آیئے میں آپ کو چھوڑ آؤں۔"

"نہیں میں خود چلا جاؤں گا مگر میں بیمار نہیں ہوں۔۔۔۔۔کبھی کبھی میرے دل میں معمولی سا درد پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ شاید وہی ہو۔۔۔۔میں ابھی ٹھیک ہو جاؤں گا۔ آپ اپنی گفتگو جاری رکھیے۔"

میں تھوڑی دیر خاموش رہا کیونکہ وہ ایسی حالت میں نہیں تھا کہ میری بات غور سے سن سکتا۔ لیکن جب اس نے اصرار کیا تو میں نے کہنا شروع کیا میں آپ سے

یہ پوچھ رہا تھا کہ ان لوگوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جو محبت کرنے کے معاملے میں بانجھ ہوتے ہیں۔۔۔ میں ایسے آدمیوں کے جذبات اور ان کی اندرونی کیفیات کا اندازہ نہیں کر سکتا لیکن جب میں اس بانجھ عورت کا تصور کرتا ہوں جو صرف ایک بیٹی یا بیٹا حاصل کرنے کے لیے دعائیں مانگتی ہے خدا کے حضور میں گڑگڑاتی ہے۔ اور جب وہاں سے کچھ نہیں ملتا تو ٹونے ٹوٹکوں میں اپنا گوہر مقصود ڈھونڈتی ہے۔ شمشانوں سے راکھ لاتی ہے کئی کئی راتیں جاگ کر سادھوؤں کے بتائے ہوئے منتر پڑھتی ہے منتیں مانتی ہے۔ چڑھاوے چڑھاتی ہے تو میں خیال کرتا ہوں کہ اس آدمی کی بھی یہی حالت ہوتی ہوگی جو محبت کے معاملے میں بانجھ ہو۔۔۔۔ ایسے لوگ واقعی ہمدردی کے قابل ہیں مجھے اندھوں پر اتنا رحم نہیں آتا۔ جتنا ان لوگوں پر آتا ہے۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ تھوک نگل کر دفعتاً اٹھ کھڑا ہوا اور پرلی طرف منہ کر کے کہنے لگا ”اوہ، بہت دیر ہوگئی مجھے ضروری کام کے لیے جانا تھا یہاں باتوں باتوں میں کتنا وقت گزر گیا۔“

میں بھی اٹھ کھڑا ہوا وہ پلٹا اور میرا ہاتھ دبا کر لیکن میری طرف دیکھے بغیر اس نے ”اب رخصت چاہتا ہوں“ کہا اور چل دیا۔

دوسری مرتبہ اس سے میری ملاقات پھر اپولو بندر ہی پر ہوئی۔ میں سیر کا عادی نہیں ہوں مگر اس زمانے میں ہر شام اپولو بندر جانا میرا دستور ہو گیا تھا ایک مہینے کے بعد جب مجھے آگرہ کے ایک شاعر نے ایک لمبا چوڑا خط لکھا جس میں اس نے نہایت ہی حریصانہ طور پر اپولو بندر اور وہاں جمع ہونے والی پریوں کا ذکر کیا اور

مجھے اس لحاظ سے بہت خوش قسمت کہا کہ میں بمبئی میں ہوں تو اپولو بندر سے میری دلچسپی ہمیشہ کے لیے فنا ہوگئی اب جب کبھی کوئی مجھے اپولو بندر جانے کو کہتا ہے تو مجھے آگرے کے شاعر کا خط یاد آجاتا ہے اور میری طبیعت متلا جاتی ہے لیکن میں اس زمانے کا ذکر کر رہا ہوں جب یہ خط مجھے نہیں ملا تھا اور میں ہر روز جا کر شام کو اپولو بندر کے اس بنچ پر بیٹھا کرتا تھا جس کے اس طرف کئی آدمی چمپی والوں سے اپنی کھوپڑیوں کی مرمت کراتے رہتے ہیں۔

دن پوری طرح ڈھل چکا تھا اور اجالے کا کوئی نشان باقی رہا تھا اکتوبر کی گرمی میں کمی واقع نہیں ہوئی تھی ہوا چل رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔ تھکے ہوئے مسافر کی طرح، سیر کرنے والوں کا ہجوم زیادہ تھا میرے پیچھے موٹریں ہی موٹریں کھڑی تھیں۔ بنچ بھی سب کے سب پر تھے جہاں بیٹھتا تھا۔ وہاں دو باتونی، ایک گجراتی اور ایک پارسی نہ جانے کب کے جمے ہوئے تھے دونوں گجراتی بولتے تھے مگر مختلف لب ولہجہ سے پارسی کی آواز میں دو سر تھے وہ کبھی باریک سر میں بات کرتا تھا کبھی موٹے سر میں جب دونوں تیزی سے بولنا شروع کر دیتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے طوطے مینا کی لڑائی ہو رہی ہے۔

میں ان کی لا متناہی گفتگو سے تنگ آ کر اٹھا اور ٹہلنے کی خاطر تاج محل ہوٹل کا رخ کرنے ہی لگا تھا کہ سامنے سے مجھے وہ آتا دکھائی دیا۔ مجھے اس کا نام معلوم نہیں تھا اس لیے میں اسے پکار نہ سکا لیکن جب اس نے مجھے دیکھا تو اس کی نگاہیں ساکن ہوگئیں، جیسے اسے وہ چیز مل گئی ہو جس کی اسے تلاش تھی۔

کوئی بنچ خالی نہیں تھا اس لیے میں نے اس سے کہا ''آپ سے بہت دیر کے

بعد ملاقات ہوئی۔۔۔۔۔چلیے سامنے ریستوران میں بیٹھتے ہیں یہاں کوئی بنچ خالی نہیں۔"

اس نے رسمی طور پر چند باتیں کیں اور ساتھ ہولیا چند گزوں کا فاصلہ طے کرنے پر ہم دونوں ریستوران میں بید کی بڑی بڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے چائے کا آرڈر دے کر میں نے اس کی طرف سگرٹوں کا ٹین بڑھا دیا۔ اتفاق کی بات ہے میں نے اسی روز دس روپے دے کر ڈاکٹر ارولکر سے مشورہ لیا تھا اور اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اول تو سگریٹ پینا ہی موقوف کر دو اور اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو اچھے سگریٹ پیا کرو مثال کے طور پر پانچ سو پچپن۔۔۔۔۔چنانچہ میں نے ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق یہ ٹین اسی شام خریدا تھا، اس نے ڈبے کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر میری طرف نگاہیں اٹھائیں کچھ کہنا چاہا مگر خاموش ہو گیا۔

میں ہنس پڑا"آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ میں نے آپ کے کہنے پر یہ سگریٹ پینا شروع کیے ہیں۔۔۔۔۔اتفاق کی بات ہے کہ آج مجھے بھی ڈاکٹر ارولکر کے پاس جانا پڑا کیونکہ کچھ دنوں سے میرے سینے میں درد ہو رہا ہے چنانچہ اس نے مجھ سے کہا کہ یہ سگریٹ پیا کرو لیکن بہت کم۔۔۔۔"

میں نے یہ کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کو میری یہ باتیں ناگوار معلوم ہوئی ہیں چنانچہ میں نے فوراً اپنی جیب سے وہ نسخہ نکالا جو ڈاکٹر ارولکر نے مجھے لکھ کر دیا تھا۔ یہ کاغذ میز پر میں نے اس کے سامنے رکھ دیا" یہ عبارت مجھ سے پڑھی تو نہیں جاتی مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے وٹامن کا سارا خاندان اس نسخے میں جمع کر دیا ہے۔"

اس کاغذ کو جس پر ابھرے ہوئے کالے حروف میں ڈاکٹر اروِلکر کا نام اور پتہ مندرج تھا اور تاریخ بھی لکھی ہوئی تھی۔ اس نے چور نگاہوں سے دیکھا اور وہ اضطراب جو اس کے چہرے پر پیدا ہو گیا تھا فوراً دور ہو گیا چنانچہ اس نے مسکرا کر کہا

''کیا وجہ ہے کہ اکثر لکھنے والوں کے اندرونا منرختم ہو جاتی ہیں؟''

میں نے جواب دیا'' اس لیے کہ انہیں کھانے کو کافی نہیں ملتا کام زیادہ کرتے ہیں لیکن اجرت بہت ہی کم ملتی ہے''

اس کے بعد چائے آ گئی اور دوسری باتیں شروع ہو گئیں

پہلی ملاقات اور اس ملاقات میں غالباً ڈھائی مہینے کا فاصلہ تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ پہلے سے زیادہ پیلا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پیدا ہو رہے تھے اسے غالباً کوئی روحانی تکلیف تھی جس کا احساس اسے ہر وقت رہتا تھا۔ کیونکہ باتیں کرتے کرتے وہ بعض اوقات ٹھہر جاتا اور اس کے ہونٹوں سے غیر ارادی طور پر آہ نکل جاتی۔ اگر ہنسنے کی کوشش بھی کرتا تو اس کے ہونٹوں میں زندگی پیدا نہیں ہوتی تھی۔

میں نے یہ کیفیت دیکھ کر اس سے اچانک طور پر پوچھا'' آپ اداس کیوں ہیں؟''

'' اداس ۔۔۔۔۔۔اداس!'' ایک پھیکی سی مسکراہٹ جوان مرنے والوں کے لبوں پر پیدا ہوا کرتی ہے جو ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ وہ موت سے خائف نہیں اس کے ہونٹوں پر پھیل'' میں اداس نہیں ہوں آپ کی طبیعت اداس ہو گی''

یہ کہہ کر اس نے ایک ہی گھونٹ میں چائے کی پیالی خالی کر دی اور اٹھ کھڑا ہوا

"اچھا تو میں اجازت چاہتا ہوں۔۔۔۔۔۔ایک ضروری کام سے جانا ہے"

مجھے یقین تھا کہ اسے کسی ضروری کام سے نہیں جانا ہے مگر میں نے اسے نہ روکا اور جانے دیا اس دفعہ پھر اس کا نام دریافت نہ کر سکا۔ لیکن اتنا پتہ چل گیا کہ وہ ذہنی اور روحانی طور پر بے حد پریشان تھا وہ اداس تھا بلکہ یوں کہیے کہ اداسی اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی تھی مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی اداسی کا دوسروں کو علم ہو۔ وہ دو زندگیاں بسر کرنا چاہتا تھا ایک وہ جو حقیقت تھی اور ایک وہ جس کی تخلیق میں وہ ہر گھڑی، ہر لمحہ مصروف رہتا تھا لیکن اس کی زندگی کے یہ دونوں پہلو ناکام تھے۔ کیوں؟۔۔۔۔۔۔ یہ مجھے معلوم نہیں۔

اس سے تیسری مرتبہ میری ملاقات پھر اپولو بندر پر ہوئی۔ اس دفعہ میں اسے اپنے گھر لے گیا۔ راستے میں ہماری کوئی بات چیت نہیں ہوئی لیکن گھر پر اس کے ساتھ بہت سی باتیں ہوئیں۔ جب وہ میرے کمرے میں داخل ہوا تو اس کے چہرے پر چند لمحات کے لیے اداسی چھا گئی مگر وہ فوراً ہی سنبھل گیا اور اس نے اپنی عادت کے خلاف اپنے آپ کو بہت ترو تازہ اور توانا ظاہر کرنے کی کوشش کی اس کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے اس پر اور بھی ترس آیا وہ ایک موت جیسی یقینی حقیقت کو جھٹلا رہا تھا اور مزہ یہ ہے کہ اس خود فریبی سے کبھی کبھی وہ مطمئن بھی نظر آتا تھا۔

باتوں کے دوران میں اس کی نظر میرے میز پر پڑی۔ شیشے کے فریم میں اس کو ایک لڑکی کی تصویر نظر آئی اٹھ کر اس نے تصویر کی طرف جاتے ہوئے کہا "کیا میں آپ کی اجازت سے یہ تصویر دیکھ سکتا ہوں"

میں نے کہا "بصد شوق!"

اس نے تصویر کو ایک نظر دیکھا اور دیکھ کر کرسی پر بیٹھ گیا ''اچھی خوبصورت لڑکی ہے۔۔۔میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی۔۔۔۔''

''جی نہیں۔۔۔۔ایک زمانہ ہا اس سے محبت کرنے کا خیال میرے دل میں پیدا ہوا تھا بلکہ یوں کہیے کہ تھوڑی سی محبت میرے دل میں پیدا ہو بھی گئی تھی مگر افسوس ہے کہ اس کو اس کی خبر تک نہ ہوئی اور میں۔۔۔۔میں۔۔۔۔نہیں بلکہ وہ بیاہ دی گئی۔۔۔یہ تصویر میری پہلی محبت کی یادگار ہے جو اچھی طرح پیدا ہونے سے پہلے ہی مر گئی۔''

''یہ آپ کی محبت کی یادگار ہے۔۔۔اس کے بعد تو آپ نے اور بہت سے رومان بھی لڑائے ہوں گے'' اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری'' یعنی۔۔۔یعنی آپ کی زندگی میں تو کوئی ایسی نامکمل اور مکمل محبتیں موجود ہوں گی۔''

میں کہنے ہی والا تھا کہ جی نہیں خاکسار بھی محبت کے معاملے میں آپ جیسا ہی بنجر ہے مگر جانے کیوں، یہ کہتا کہتا رک گیا اور خواہ مخواہ جھوٹ بول دیا'' جی ہاں۔۔۔ایسے سلسلے ہوتے ہی رہتے ہیں۔۔۔آپ کی کتاب زندگی بھی تو ایسے واقعات سے بھرپور ہوگی۔''

وہ کچھ نہ بولا اور بالکل خاموش ہو گیا جیسے کسی گہرے سمندر میں غوطہ لگا گیا ہے۔دیر تک جب وہ اپنے خیالات میں غرق رہا اور میں اس کی خاموشی سے اداس ہونے لگا تو میں نے کہا'' اجی حضرت! آپ کن خیالات میں کھو گئے؟''

وہ چونک پڑا'' میں۔۔۔میں۔۔۔۔کچھ نہیں، میں ایسے ہی کچھ سوچ رہا تھا''

میں نے پوچھا "کوئی بیتی ہوئی کہانی یاد آ گئی۔۔۔۔۔کوئی بچھڑا ہوا سپنا مل گیا۔۔۔پرانے زخم ہرے ہو گئے"

"زخم۔۔۔۔پرانے۔۔۔۔زخم۔۔۔۔کئی زخم تو نہیں۔۔۔صرف ایک ہی ہے بہت گہرا، بہت کاری۔۔۔اور زخم میں چاہتا بھی نہیں ایک ہی زخم کافی ہے" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میرے کمرے میں ٹہلنے کی کوشش کرنے لگا کیونکہ اس چھوٹی سی جگہ میں جہاں کرسیاں، میز اور چارپائی سب کچھ پڑا تھا ٹہلنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ میز کے پاس اسے رکنا پڑا۔ تصویر کو اب کی دفعہ گہری نظروں سے دیکھا اور کہا "اس میں اور اس میں کتنی مشابہت ہے۔۔۔مگر اس کے چہرے پر ایسی شوخی نہیں تھی اس کی آنکھیں بڑی تھیں مگر ان آنکھوں کی طرح ان میں شرارت نہیں تھی وہ فکر مند آنکھیں تھیں ایسی آنکھیں جو دیکھتی بھی ہیں اور سمجھتی بھی ہیں" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک سرد آہ بھری اور کرسی پر بیٹھ گیا "موت بالکل ناقابل فہم چیز ہے خاص طور پر اس وقت جبکہ یہ جوانی میں آئے۔۔۔۔۔میں سمجھتا ہوں کہ خدا کے علاوہ ایک اور طاقت بھی ہے جو بڑی حاسد ہے۔ جو کسی کو خوش دیکھنا نہیں چاہتی۔۔۔۔مگر چھوڑیئے اس قصے کو۔"

میں نے اس سے کہا "نہیں۔۔۔نہیں۔۔آپ سناتے جائیے۔۔۔لیکن اگر آپ ایسا مناسب سمجھیں۔۔۔۔سچ پوچھئے تو میں یہ سمجھ رہا تھا کہ آپ نے کبھی محبت کی ہی نہ ہو گی۔"

"یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں نے کبھی محبت کی ہی نہیں اور ابھی ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ میری کتاب زندگی ایسے کئی واقعات سے بھری پڑی ہو گی" یہ کہہ

کر اس نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا ''میں نے اگر محبت نہیں کی تو یہ دکھ میرے دل میں کہاں سے پیدا ہو گیا ہے؟ میں نے اگر محبت نہیں کی تو میری زندگی کو یہ روگ کہاں سے چمٹ گیا ہے؟ میں اداس کیوں رہتا ہوں۔۔۔۔ مجھے اپنے آپ کا ہوش کیوں نہیں ہے؟ میں روز بروز موم کی طرح کیوں پگھلا جا رہا ہوں؟''

بظاہر یہ تمام سوال وہ مجھ سے کر رہا تھا مگر دراصل وہ سب کچھ اپنے آپ ہی سے پوچھ رہا تھا۔

میں نے کہا ''میں نے جھوٹ بولا تھا کہ آپ کی زندگی میں ایسے کئی واقعات ہوں گے مگر آپ نے بھی تو جھوٹ بولا تھا کہ میں اداس نہیں ہوں اور مجھے کوئی روگ نہیں ہے۔۔۔ کسی کے دل کا حال جاننا آسان بات نہیں ہے۔ آپ کی اداسی کی اور بہت سی وجہیں ہو سکتی ہیں مگر جب تک مجھے آپ خود نہ بتائیں میں کسی نتیجے پر کیسے پہنچ سکتا ہوں۔۔۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ واقعی روز بروز کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ کو یقیناً بہت بڑا صدمہ پہنچا ہے اور ۔۔۔اور۔۔۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔''

''ہمدردی۔۔۔۔۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ''مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں اس لیے کہ ہمدردی اسے واپس نہیں لا سکتی۔۔۔۔۔ اس عورت کو موت کی گہرائیوں سے نکال کر میرے حوالے نہیں کر سکتی جس سے مجھے پیار تھا۔۔۔ آپ نے محبت نہیں کی۔۔۔ مجھے یقین ہے آپ نے محبت نہیں کی اس لیے کہ اس کی ناکامی نے آپ پر کوئی داغ نہیں چھوڑا۔۔۔ میری طرف دیکھیے''

یہ کہہ کر اس نے خود اپنے آپ کو دیکھا "کوئی جگہ آپ کو ایسی نہیں ملے گی جہاں میری محبت کے نقش موجود نہ ہوں۔۔۔میرا وجود خود اس محبت کی ٹوٹی ہوئی عمارت کا ملبہ ہے۔۔۔میں آپ کو یہ داستان کیسے سناؤں اور کیوں سناؤں جبکہ آپ اسے سمجھ ہی نہیں سکیں گے۔۔۔کسی کا یہ کہہ دینا کہ میری ماں مر گئی ہے آپ کے دل پر وہ اثر پیدا نہیں کر سکتا جو موت نے بیٹے پر کیا تھا۔۔۔میری داستان محبت آپ کو۔۔۔کسی کو بھی بالکل معمولی معلوم ہو گی مگر مجھ پر جو اثر ہوا ہے اس سے کوئی بھی آگاہ نہیں ہو سکتا اس لیے کہ محبت میں نے کی ہے اور سب کچھ صرف مجھی پر گزرا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اس کے حلق میں تلخی پیدا ہو گئی تھی کیونکہ وہ بار بار تھوک نگلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیا وہ آپ کو دھوکا دے گئی" میں نے اس سے پوچھا "یا کچھ اور حالات تھے؟"

"دھوکا۔۔۔وہ دھوکا دے ہی نہیں سکتی تھی۔خدا کے لیے دھوکا نہ کہیے وہ عورت نہیں فرشتہ تھی مگر برا ہو اس موت کو جو ہمیں خوش نہ دیکھ سکی اور اسے ہمیشہ کے لیے اپنے پروں میں سمیٹ کر لے گئی۔۔۔۔آہ!۔۔۔آپ نے میرے دل پر خراشیں پیدا کر دی ہیں۔سنیے۔۔۔۔سنیے۔۔۔میں آپ کو اس دردناک داستان کا کچھ حصہ سناتا ہوں۔۔وہ ایک بڑے اور امیر گھرانے کی لڑکی تھی جس زمانے میں اس کی اور میری پہلی ملاقات ہوئی۔میں اپنے باپ دادا کی ساری جائیداد عیاشیوں میں برباد کر چکا تھا۔میرے پاس ایک کوڑی بھی نہیں تھی۔اپنا

وطن چھوڑ کر میں لکھنو چلا آیا۔ اپنی موٹر چونکہ میرے پاس ہوا کرتی تھی اس لیے میں صرف موٹر چلانے کا کام جانتا تھا چنانچہ میں نے اسی کو اپنا پیشہ قرار دینے کا فیصلہ کیا پہلی ملازمت مجھے ڈپٹی صاحب کے یہاں ملی۔ جن کی وہ اکلوتی لڑکی تھی۔۔۔" یہ کہتے کہتے وہ اپنے خیالات میں کھو گیا اور دفعتا چپ وہ گیا۔ میں بھی خاموش رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ چونکا اور کہنے لگا "میں کیا کہہ رہا تھا؟"

آپ ڈپٹی صاحب کے یہاں ملازم ہو گئے

"ہاں۔۔۔۔۔۔ وہ انہی ڈپٹی صاحب کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ہر روز صبح نو بجے میں زہرہ کو موٹر میں سکول لے جایا کرتا تھا وہ پردہ کرتی تھی مگر موٹر ڈرائیور سے کوئی کب تک چھپ سکتا ہے۔ میں نے اسے دوسرے روز ہی دیکھ لیا۔۔۔۔ وہ صرف خوبصورت ہی نہیں تھی بلکہ اس میں ایک خاص بات بھی تھی۔۔۔۔۔۔ بڑی سنجیدہ اور متین لڑکی تھی اس کی سیدھی مانگ نے اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کا وقار پیدا کر دیا تھا وہ۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔ میں کیا عرض کروں وہ کیا تھی میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں اس کی صورت اور سیرت بیان کر سکوں۔"

بہت دیر تک وہ اپنی زہرہ کی خوبیاں بیان کرتا رہا اس دوران میں نے کئی مرتبہ اس کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خیالات اس کے دماغ میں ضرورت سے زیادہ جمع ہو گئے ہیں۔ کبھی کبھی بات کرتے کرتے اس کا چہرہ تمتما اٹھتا لیکن پھر اداسی چھا جاتی اور وہ آہوں میں گفتگو کرنا شروع کر دیتا۔ وہ اپنی داستان بہت آہستہ آہستہ سنا رہا تھا جیسے خود بھی مزہ لے رہا ہو۔ ایک ایک ٹکڑا جوڑ کر اس نے اپنی ساری کہانی پوری کی۔ جس کا ماحصل یہ تھا۔

زہرہ سے اسے بے پناہ محبت ہوگئی کچھ دن تو موقع پا کر اس کا دیدار کرنے اور طرح طرح کے منصوبے باندھنے میں گزر گئے۔ مگر جب اس نے سنجیدگی سے اس محبت پر غور کیا تو خود کو زہرہ سے بہت دور پایا ایک موٹر ڈرائیور اپنے آقا کی لڑکی سے محبت کیسے کر سکتا ہے؟ چنانچہ جب اس تلخ حقیقت کا احساس اس کے دل میں پیدا ہوا تو وہ مغموم رہنے لگا لیکن ایک روز اس نے بڑی جرأت سے کام لیا کاغذ کے ایک پرزے پر اس نے زہرہ کو چند سطریں لکھیں۔۔۔ یہ سطریں مجھے یاد ہیں۔

''زہرہ! میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں تمہارا نوکر ہوں تمہارے والد صاحب مجھے تیس روپے ماہوار دیتے ہیں مگر میں تم سے محبت کرتا ہوں۔۔۔۔۔۔ میں کیا کروں، کیا نہ کروں، میری سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔''

یہ سطریں کاغذ پر لکھ کر اس نے کاغذ اس کی ایک کتاب میں رکھ دیا دوسرے روز جب وہ اسے موٹر میں سکول لے گیا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے ہینڈل کئی بار اس کی گرفت سے نکل نکل گیا مگر خدا کا شکر ہے کہ کوئی ایکسیڈنٹ نہ ہوا۔ اس روز اس کی کیفیت عجیب رہی شام کو جب وہ زہرہ کو سکول سے واپس لا رہا تھا تو راستے میں اس لڑکی نے موٹر روکنے کے لیے کہا اس نے جب موٹر روک لی تو زہرہ نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہا ''دیکھو نعیم آئندہ تم ایسی حرکت کبھی نہ کرنا میں نے ابھی تک اباجی سے تمہارے اس خط کا ذکر نہیں کیا جو تم نے میری کتاب میں رکھ دیا تھا لیکن اگر پھر تم نے ایسی حرکت کی تو مجبوراً ان سے شکایت کرنا پڑے گی۔

مجھے۔۔۔۔۔چلو اب موٹر چلاؤ۔"

اس گفتگو کے بعد اس نے بہت کوشش کی کہ ڈپٹی صاحب کی نوکری چھوڑ دے اور زہرہ کی محبت کو اپنے دل سے ہمیشہ کے لیے مٹا دے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا ایک مہینہ اسی کشمکش میں گزر گیا۔ ایک روز اس نے پھر جرأت سے کام لے کر خط لکھا اور زہرہ کی ایک کتاب میں رکھ کر اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کرنے لگا اسے یقین تھا کہ دوسرے روز صبح کو اسے نوکری سے برطرف کر دیا جائے گا مگر ایسا نہ ہوا شام کو سکول سے واپس آتے ہوئے زہرہ اس سے ہم کلام ہوئی اور ایک بار پھر اس کو ایسی حرکتوں سے باز رہنے کے لیے کہا "اگر تمہیں اپنی عزت کا خیال نہیں تو کم از کم میری عزت کا تو کچھ خیال تمہیں ہونا چاہیے۔" یہ اس نے ایک بار پھر اسے کچھ اس سنجیدگی اور متانت سے کہا کہ نعیم کی ساری امیدیں فنا ہو گئیں اور اس نے قصد کر لیا کہ وہ نوکری چھوڑ دے گا اور لکھنو سے ہمیشہ کے لیے چلا جائے گا مہینے کے اخیر میں نوکری چھوڑنے سے پہلے اس نے اپنی کوٹھڑی میں لالٹین کی مدھم روشنی میں زہرہ کو آخری خط لکھا اس میں اس نے نہایت درد بھرے لہجے میں اس سے کہا "زہرہ! میں نے بہت کوشش کی کہ میں تمہارے کہے پر عمل کر سکوں مگر دل پر میرا اختیار نہیں ہے یہ میرا آخری خط ہے، کل شام کو میں لکھنو چھوڑ دوں گا اس لیے تمہیں اپنے والد سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری خاموشی میری قسمت کا فیصلہ کر دے گی مگر یہ خیال نہ کرنا کہ تم سے دور رہ کر تم سے محبت نہیں کروں گا میں جہاں کہیں بھی رہوں گا میرا دل تمہارے قدموں میں رہے گا میں ہمیشہ ان دنوں کو یاد کرتا رہوں گا جب میں موٹر اس لیے آہستہ آہستہ چلاتا تھا کہ تمہیں دھکا نہ

لگے۔۔۔میں اس کے سوا اور تمہارے لیے کر ہی کیا سکتا تھا۔۔"

یہ خط بھی اس نے موقع پا کر اس کی کتاب میں رکھ دیا صبح کو زہرہ نے سکول جاتے ہوئے اس سے کوئی بات نہ کی اور شام کو بھی راستے میں اس نے کچھ نہ کہا چنانچہ وہ بالکل نا امید ہو کر اپنی کوٹھڑی میں چلا آیا جو تھوڑا بہت اسباب اس کے پاس تھا باندھ کر اس نے ایک طرف رکھ دیا اور لالٹین کی اندھی روشنی میں چارپائی پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ زہرہ اور اس کے درمیان کتنا بڑا فاصلہ ہے۔

وہ بے حد مغموم تھا اپنی پوزیشن سے اچھی طرح واقف تھا اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ ایک ادنیٰ درجے کا ملازم ہے اور اپنے آقا کی لڑکی سے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی سوچتا تھا کہ اگر وہ اس سے محبت کرتا ہے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے اور پھر اس کی محبت فریب تو نہیں وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ آدھی رات کے قریب اس کی کوٹھڑی کے دروازے پر دستک ہوئی اس کا دل دھک سے رہ گیا لیکن پھر اس نے خیال کیا کہ مالی ہو گا ممکن ہے اس کے گھر میں کوئی ایکا ایکی بیمار پڑ گیا ہو اور وہ اس سے مدد لینے کے لیے آیا ہو لیکن جب اس نے دروازہ کھولا تو زہرہ سامنے کھڑی تھی۔۔۔۔جی ہاں زہرہ۔۔۔دسمبر کی سردی میں شال کے بغیر وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔اس کی زبان گنگ ہو گئی اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیا کہے چند لمحات قبر کی سی خاموشی میں گزر گئے آخر زہرہ کے ہونٹ وا ہوئے اور تھرتھراتے ہوئے لہجے میں اس نے کہا" نعیم میں تمہارے پاس آ گئی ہوں بتاؤ اب تم کیا چاہتے ہو۔۔۔لیکن اس سے پہلے کہ تمہاری اس کوٹھڑی میں داخل ہوں میں تم سے چند سوال کرنا چاہتی ہوں۔"

نعیم خاموش رہا لیکن زہرہ اس سے پوچھنے لگی ''کیا واقعی تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟''

نعیم کو جیسے ٹھیس سی لگی اس کا چہرہ تمتما اٹھا ''زہرہ تم نے ایسا سوال کیا ہے جس کا جواب اگر میں دوں تو میری محبت کی توہین ہو گی۔۔۔ میں تم سے پوچھتا ہوں، کیا میں محبت نہیں کرتا؟''

زہرہ نے اس سوال کا جواب نہ دیا اور تھوڑی دیر خاموش رہ کر اپنا دوسرا سوال کیا

''میرے باپ کے پاس کافی دولت ہے مگر میرے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں جو کچھ میرا کہا جاتا ہے میرا نہیں، ان کا ہے۔ کیا تم مجھے دولت کے بغیر بھی ویسا ہی عزیز سمجھو گے؟''

نعیم بہت جذباتی آدمی تھا چنانچہ اس سوال نے بھی اس کے وقار کو زخمی کیا بڑے دکھ بھرے لہجے میں اس نے زہرہ سے کہا ''زہرہ خدا کے لیے مجھ سے ایسی باتیں نہ پوچھو جن کا جواب اس قدر عام ہو چکا ہے کہ تمہیں تھرڈ کلاس عشقیہ ناولوں میں بھی مل سکتا ہے''

زہرہ اس کی کوٹھری میں داخل ہو گئی اور اس کی چارپائی پر بیٹھ کر کہنے لگی ''میں تمہاری ہوں اور ہمیشہ تمہاری رہوں گی''

زہرہ نے اپنا قول پورا کیا جب دونوں لکھنو چھوڑ کر دہلی چلے آئے اور شادی کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگے تو ڈپٹی صاحب ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں پہنچ گئے نعیم کو نوکری مل گئی تھی اس لیے وہ گھر میں نہیں تھا ڈپٹی صاحب نے

زہرہ کو بہت برا بھلا کہا ان کی ساری عزت خاک میں مل گئی تھی وہ چاہتے تھے کہ زہرہ نعیم کو چھوڑ دے اور جو کچھ ہو چکا ہے اسے بھول جائے وہ نعیم کو دو تین ہزار روپیہ دینے کے لیے بھی تیار تھے مگر انہیں نا کام لوٹنا پڑا۔ اس لیے کہ زہرہ نعیم کو کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوئی اس نے اپنے باپ سے کہا ''ابا جی! میں نعیم کے ساتھ بہت خوش ہوں آپ اس سے اچھا شوہر میرے لیے کبھی تلاش نہ کر سکتے میں اور وہ آپ سے کچھ نہیں مانگتے اگر آپ ہمیں دعائیں دے سکیں تو ہم آپ کے ممنون ہوں گے۔''

ڈپٹی صاحب نے جب یہ گفتگو سنی تو بہت خشم آلود ہوئے انہوں نے نعیم کو قید کرا دینے کی دھمکی بھی دی مگر زہرہ نے صاف صاف کہہ دیا ''ابا جی! اس میں نعیم کا کیا قصور ہے سچ تو یہ ہے کہ ہم دونوں بے قصور ہیں البتہ ہم ایک دوسرے سے محبت ضرور کرتے ہیں اور وہ میرا شوہر ہے۔۔۔۔ یہ کوئی قصور نہیں ہے میں نابالغ نہیں ہوں''

ڈپٹی صاحب عقلمند تھے فوراً سمجھ گئے کہ جب ان کی بیٹی ہی رضامند ہے تو نعیم پر کیسے جرم عائد ہو سکتا ہے چنانچہ وہ زہرہ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے گئے کچھ عرصے کے بعد ڈپٹی صاحب نے مختلف لوگوں کے ذریعے نعیم پر دباؤ ڈالنے اور اس کو روپے پیسے سے لالچ دینے کی کوشش کی مگر نا کام رہے۔

دونوں کی زندگی بڑے مزے میں گزر رہی تھی گو نعیم کی آمدن بہت ہی کم تھی اور زہرہ کو جو ناز و نعمت میں پلی تھی بدن پر کھردرے کپڑے پہننے پڑتے تھے اور اپنے ہاتھ سے سب کام کرنے پڑتے تھے مگر وہ خوش تھی اور خود کو ایک نئی دنیا میں

پاتی تھی جہاں قدم قدم پر نعیم کی محبت کے نئے نئے پہلو اس پر منکشف ہوتے تھے وہ بہت سکھی تھی۔۔۔۔بہت سکھی، نعیم بھی بہت خوش تھا لیکن ایک روز خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ زہرہ کے سینے میں ایک موذی درد اٹھا اور پیشتر اس کے کہ نعیم اس کے لیے کچھ کر سکے وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئی اور نعیم کی دنیا ہمیشہ کے لیے تاریک کر گئی۔

یہ داستان اس نے رک رک کر اور خوب مزے لے لے کر قریباً چار گھنٹوں میں سنائی۔ جب وہ اپنا حال دل سنا چکا تو اس کا چہرہ بجائے زرد ہونے کے تمتما اٹھا جیسے اس کے اندر آہستہ آہستہ کسی نے خون داخل کر دیا ہے لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس کا حلق سوکھ گیا تھا۔

داستان جب ختم ہوگئی تو وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا، جیسے اسے بہت جلدی ہے اور کہنے لگا "میں نے بہت غلطی کی۔۔۔جو آپ کی اپنی داستان محبت سنا دی۔۔۔۔میں نے بہت غلطی کی۔۔۔۔زہرہ کا ذکر صرف مجھی تک محدود رہنا چاہیے تھا۔۔۔۔لیکن ۔۔۔۔لیکن۔۔۔" اس کی آواز بھرا گئی۔۔۔"میں زندہ ہوں اور وہ۔۔۔وہ۔۔۔۔" اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا اور جلدی سے میرا ہاتھ دبا کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

نعیم سے پھر میری ملاقات نہ ہوئی اپولو بندر پر کئی مرتبہ اس کی تلاش میں گیا مگر وہ نہ ملا چھ یا سات مہینے کے بعد اس کا ایک خط مجھے ملا جو میں یہاں پر نقل کر رہا ہوں۔

"۔۔۔صاحب!"

آپ کو یاد ہو گا میں نے آپ کے مکان پر اپنی داستان عشق سنائی تھی۔۔۔۔۔۔۔وہ محض افسانہ تھا ایک جھوٹا افسانہ کوئی زہرہ ہے نہ نعیم۔۔۔۔میں ویسے موجود تو ہوں مگر وہ نعیم نہیں ہوں جس نے زہرہ سے محبت کی تھی آپ نے ایک بار کہا تھا کہ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو محبت کے معاملے میں بانجھ ہوتے ہیں میں بھی ان بد قسمت آدمیوں میں سے ایک ہوں جن کی ساری جوانی اپنا دل پرچانے میں گزر گئی زہرہ سے نعیم کی محبت ایک دل بہلاوا تھا اور زہرہ کی موت۔۔۔۔میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا کہ میں نے اسے کیوں مار دیا بہت ممکن ہے کہ اس میں بھی میری زندگی کی سیاہی کا دخل ہو۔

مجھے معلوم نہیں آپ نے میرے افسانے کو جھوٹا سمجھا یا سچا لیکن میں آپ کو ایک عجیب وغریب بات بتاتا ہوں کہ میں نے۔۔۔۔یعنی اس جھوٹے فسانے کے خالق نے اس کو بالکل سچا سمجھا سو فیصدی حقیقت پر مبنی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے واقعی زہرہ سے محبت کی ہے اور وہ سچ مچ مر چکی ہے آپ کو یہ سن کر اور بھی تعجب ہو گا کہ جوں جوں وقت گزرتا گیا اس افسانے کے اندر حقیقت کا عنصر زیادہ ہوتا گیا اور زہرہ کی آواز اس کی ہنسی بھی میرے کانوں میں گونجنے لگی میں اس کے سانس کی گرمی تک محسوس کرنے لگا افسانے کا ہر ذرہ جاندار ہو گیا اور میں نے۔۔۔۔۔اور میں نے یوں اپنی قبر اپنے ہاتھوں سے کھودی۔

زہرہ فسانہ نہ سہی مگر میں تو فسانہ ہوں وہ مر چکی ہے، اس لیے مجھے بھی مر جانا چاہیے یہ خط آپ کو میری موت کے بعد ملے گا۔۔۔۔الوداع۔۔۔زہرہ مجھے ضرور ملے گی۔۔۔۔کہاں؟۔۔۔۔یہ مجھے معلوم نہیں

میں نے یہ چند سطور صرف اس لیے آپ کو لکھ دی ہیں کہ آپ افسانہ نگار ہیں اگر اس سے آپ افسانہ تیار کر لیں تو آپ کو سات آٹھ روپے مل جائیں گے کیونکہ ایک مرتبہ آپ نے کہا تھا کہ افسانے کا معاوضہ آپ و ک سات سے دس روپے تک مل جایا کرتا ہے یہ میرا تحفہ ہوگا اچھا الوداع۔

آپ کا ''ملاقاتی نعیم''

نعیم نے اپنے لیے زہرہ بنائی اور مر گیا۔۔۔میں نے اپنے لیے یہ افسانہ تخلیق کیا ہے اور زندہ ہوں۔۔۔۔یہ میری زیادتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆

باسط

باسط بالکل رضامند نہیں تھا لیکن ماں کے سامنے اس کی کوئی پیش نہ چلی اول اول تو اس کو اتنی جلدی شادی کرنے کی خواہش نہیں تھی اس کے علاوہ وہ لڑکی بھی اسے پسند نہیں تھی جس سے اس کی ماں اس کی شادی کرنے پر تلی ہوئی تھی وہ بہت دیر تک ٹالتا رہا۔ جتنے بہانے بنا سکتا تھا اس نے بنائے، لیکن آخر ایک روز اس کو ماں کی اٹل خواہش کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہی پڑا اور اصل انکار کرتے کرتے وہ بھی تنگ آ گیا تھا چنانچہ اس نے دل میں سوچا" یہ بک بک ختم ہی ہو جائے تو اچھا ہے، ہونے دو شادی، کوئی قیامت تو نہیں ٹوٹ پڑے گی۔۔۔۔۔ میں نبھالوں گا"

اس کی ماں بہت خوش ہوئی لڑکی والے اس کے عزیز تھے اور وہ عرصہ ہوا ان کو زبان دے چکی تھی جب باسط نے ہاں کی تو وہ تاریخ پکی کرنے کے لیے لڑکی والوں کے ہاں گئی انہوں نے ٹال مٹول کی تو باسط کی ماں کو بہت غصہ آیا۔" سعیدہ کی ماں! میں نے اتنی مشکلوں سے باسط کو رضامند کیا ہے، اب تم تاریخ پکی نہیں کر رہی ہو شادی ہو گی تو اسی مہینے کی بیس کو ہو گی نہیں تو نہیں ہو گی اور یہ بات سولہ آنے پکی ہے سمجھ لیا"

دھمکی نے کام کیا لڑکی کی ماں بالآخر راضی ہو گئی سب تیاریاں مکمل ہوئیں بیس کو دلہن گھر میں تھی باسط کو گو وہ پسند نہیں تھی، لیکن وہ اس کے ساتھ نبھانے کا فیصلہ کر چکا تھا، چنانچہ وہ اس سے بڑی محبت سے پیش آیا۔ اس پر بالکل ظاہر نہ ہونے دیا

کہ وہ اس سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اور یہ کہ وہ زبردستی اس کے سر منڈھ دی گئی ہے۔

نئی دلہنیں عام طور پر بہت شرمیلی ہوتی ہیں لیکن باسط نے محسوس کیا کہ سعیدہ ضرورت سے زیادہ شرمیلی ہے۔ اس کے اس شرمیلے پن میں کچھ خوف بھی تھا جیسے وہ باسط سے ڈرتی ہے شروع شروع میں باسط نے سوچا کہ یہ چیز دور ہو جائے گی مگر وہ بڑھتی ہی گئی۔ باسط نے اس کو چند روز کے لیے میکے بھیج دیا واپس آئی تو اس کا خوف آلود شرمیلا پن ایک حد تک دور ہو چکا تھا باسط نے سوچا ایک دو مرتبہ اور میکے جائے گی تو ٹھیک ہو جائے گی مگر اس کا یہ قیاس غلط نکلا سعیدہ پھر خوف زدہ رہنے لگی۔

باسط نے ایک روز اس سے پوچھا "سعیدہ تم ڈری ڈری کیوں رہتی ہو"

سعیدہ یہ سن کر چونکی "نہیں تو۔۔۔۔۔۔نہیں تو"

باسط نے اس سے بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا "آخر بات کیا ہے۔۔۔۔۔۔خدا کی قسم مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے۔۔۔۔۔کس بات کا ڈر ہے تمہیں۔۔۔۔۔۔میری ماں اتنی اچھی ہے وہ تم سے ساسوں کا سا سلوک نہیں کرتی میں تم سے اتنی محبت کرتا ہوں۔۔۔پھر تم ایسی صورت کیوں بنائے رکھتی ہو کہ معلوم ہوتا ہے تمہیں یہ خوف ہے کہ کوئی تمہیں پیٹے گا" یہ کہہ کر اس نے سعیدہ کا منہ چوما۔

سعیدہ خاموش رہی اس کی آنکھیں البتہ اور زیادہ خوف زدہ ہو گئیں باسط نے اس کو اور پیار کیا اور کہا "تمہیں ہر وقت ہنستی رہنا چاہیے۔۔۔۔۔لو اب ذرا ہنسو۔۔۔ہنسو میری جان!"

سعیدہ نے ہنسنے کی کوشش کی باسط نے پیار سے اس کو تھپکی دی''
شاباش۔۔۔۔اسی طرح مسکراتا چہرہ ہونا چاہیے ہر وقت!''

باسط کی یہ محبت ظاہر ہے کہ بالکل مصنوعی تھی، کیونکہ سعیدہ کے لیے اس کے دل میں کوئی جگہ نہیں تھی لیکن وہ صرف اپنی ماں کی خاطر چاہتا تھا کہ سعیدہ سے اس کا رشتہ ناکام ثابت نہ ہو اس کی ماں اپنی شکست کبھی برداشت نہ کرسکتی اس نے اپنی زندگی میں شکست کا منہ دیکھا ہی نہیں تھا اس لیے باسط کی انتہائی کوشش یہی تھی کہ سعیدہ سے اس کی نبھ جائے، چنانچہ اپنے دل میں سعیدہ کے لیے اس نے بڑے خلوص کے ساتھ مصنوعی محبت پیدا کرلی تھی۔

اس کی ہر آسائش کا خیال رکھتا تھا اپنی ماں سے سعیدہ کی چھوٹی سی بات کی بھی تعریف کرتا تھا جب وہ یہ محسوس کرتا کہ اس کی ماں بہت مطمئن ہے، اس بات سے مطمئن ہے کہ اس نے باسط کا رشتہ ٹھیک جگہ کیا ہے تو اس کو دلی خوشی ہوتی۔

شادی کو ایک مہینہ ہوگیا اس دوران میں سعیدہ کئی مرتبہ میکے گئی باسط کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا وہ سمجھتا تھا کہ یوں اس کا خوف آلود شرمیلا پن دور ہو جائے گا مگر ایسا نہ ہوا یہ دن بہ دن بڑھتا چلا جارہا تھا اب تو سعیدہ وحشت زدہ دکھائی دیتی تھی باسط حیران تھا کہ بات کیا ہے اس کے بارے میں اس نے ماں سے کوئی بات نہ کی اس لیے کہ اسے یقین تھا کہ وہ اس کو ڈانٹ پلاتیں'' بکواس نہ کرو مجھے معلوم تھا تم ضرور ایک روز اس میں کیڑے ڈالو گے۔''

باسط نے سعیدہ ہی سے کہا''میری جان! تم مجھے بتاتی کیوں نہیں ہو''

سعیدہ چونک اٹھی''جی؟''

اس کے چونکنے پر باسط نے یوں محسوس کیا جیسے اس نے سعیدہ کی کسی دکھتی رگ پر زور سے ہاتھ رکھ دیا تھا لہجے میں اور زیادہ پیار بھر کے اس نے کہا۔۔۔۔۔"

میں نے پوچھا تھا کہ اب تم اور زیادہ خوف زدہ رہنے لگی ہو آخر بات کیا ہے۔"

سعیدہ نے تھوڑے توقف کے بعد جواب دیا" بات تو کچھ بھی نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔میں ذرا بیمار ہوں"

"کیا بیماری ہے۔۔۔۔۔۔تم نے مجھ سے کبھی ذکر ہی نہیں کیا"

سعیدہ نے دوپٹے کے کنارے کو انگلی پر لپیٹتے ہوئے جواب دیا" امی جان! علاج کرا رہی ہیں میرا جلدی ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

باسط نے سعیدہ سے اور زیادہ دلچسپی لینا شروع کی تو اس نے دیکھا کہ وہ ہر روز چھپ کر کوئی دوا کھاتی ہے۔ایک دن جب کہ وہ اپنے قفل لگے ٹرنک سے دوا نکال کر کھانے والی تھی وہ اس کے پاس پہنچ گیا وہ زور سے چونکی سفوف کی کھلی ہوئی پڑیا اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔باسط نے اس سے پوچھا" یہ دوا کھاتی ہو"

سعیدہ نے تھوک نگل کر جواب دیا" جی ہاں۔۔۔۔۔۔۔امی جان نے حکیم صاحب سے منگوائی تھی۔"

"کچھ افاقہ ہے اس سے"

"جی ہاں"

"تو کھاؤ۔۔۔اگر آرام نہ آئے تو مجھ سے کہنا میں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا"

سعیدہ نے پڑیا فرش پر سے اٹھائی اور سر ہلا کر کہا" جی اچھا"

باسط چلا گیا اس نے سوچا ''اچھا ہے کوئی علاج تو ہو رہا ہے خدا کرے اچھی ہو جائے میرا خیال ہے یہ ڈر و کچھ نہیں بیماری ہے۔۔۔۔۔دور ہو جائے گی انشاءاللہ!''

اس نے سعیدہ کی اس بیماری کا اپنی ماں سے پہلی بار ذکر کیا تو کہنے لگی۔۔۔۔۔''بکواس ہے خدا کے فضل و کرم سے اچھی بھلی ہے، کیا بیماری ہے اسے؟''

باسط نے کہا ''مجھے کیا معلوم امی جان! یہ تو سعیدہ ہی بتا سکتی ہے آپ کو''

باسط کی ماں نے بڑی بے پروائی سے کہا ''میں پوچھوں گی اس سے'' جب سعیدہ سے دریافت کیا تو اس نے جواب دیا ''کچھ نہیں خالہ جان! سر میں درد رہتا تھا امی جان نے حکیم صاحب سے دوا منگا دی تھی۔ اصل میں باسط صاحب بڑے وہمی ہیں۔۔۔۔۔ہر وقت کہتے رہتے ہیں کہ تم ڈری ڈری سی دکھائی دیتی ہو مجھے ڈر کس بات کا ہو گا بھلا''

باسط کی ماں نے کہا ''بکواس کرتا ہے تم اس کی فضول باتوں کا خیال نہ کیا کرو''

چند روز کے بعد باسط نے محسوس کیا کہ سعیدہ بہت ہی زیادہ گھبرائی ہوئی ہے اس کا اضطراب اس کے روئیں روئیں سے ظاہر ہوتا تھا شام کے قریب اس نے باسط سے کہا ''امی جان سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔۔۔۔۔مجھے وہاں چھوڑ آیئے''

باسط نے جواب دیا ''نہیں سعیدہ! آج تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے''

سعیدہ نے اصرار کیا ''آپ مجھے وہاں چھوڑ آیئے ٹھیک ہو جاؤں گی''

باسط نے انکار کر دیا ''وہاں طبیعت ٹھیک ہو سکتی ہے تو یہاں بھی ٹھیک ہو سکتی ہے، جاؤ آرام سے لیٹ جاؤ''

باسط کی ماں آ گئی باسط نے اس سے کہا ’’امی جان! دیکھئے سعیدہ ضد کر رہی ہے طبیعت اس کی ٹھیک نہیں، کہتی ہے مجھے امی جان کے پاس لے چلو۔‘‘

باسط کی ماں نے بڑی بے پروائی سے کہا ’’کل چلی جانا سعیدہ!‘‘

سعیدہ نے اور کچھ نہ کہا خاموش ہو کر باہر صحن میں چلی گئی تھوڑی دیر کے بعد باسط باہر نکلا۔ سعیدہ صحن میں نہیں تھی اس نے ادھر ادھر تلاش کیا مگر وہ نہ ملی باسط نے سوچا اوپر کوٹھے پر ہوگی اوپر گیا تو غسل خانے کا دروازہ بند تھا کھٹکھٹا کر اس نے آواز دی ’’سعیدہ!‘‘

کوئی جواب نہ ملا تو پھر پکارا ’’سعیدہ!‘‘

اندر سے بڑی نحیف آواز آئی ’’جی!‘‘

باسط نے پوچھا ’’کیا کر رہی ہو‘‘

اور زیادہ نحیف آواز آئی ’’نہا رہی ہوں‘‘

باسط نیچے آ گیا سعیدہ کے بارے میں سوچتا سوچتا باہر گلی میں نکلا موری کی طرف نظر پڑی تو اس میں خون ہی خون تھا اور یہ خون اس غسل خانے سے آ رہا تھا جس میں سعیدہ نہا رہی تھی باسط کے ذہن میں تلے اوپر کئی خیالات اوندھے سیدھے گرے پھر یہ گردان شروع ہو گئی ’’دوا۔۔۔خون۔۔۔۔خون۔۔۔۔دوا۔۔۔ڈر۔۔۔دوا۔۔۔۔خون۔۔۔ڈر۔۔۔‘‘

پھر اس نے آہستہ آہستہ سوچنا شروع کیا۔ سعیدہ کی ماں شادی کی تاریخ پکی نہیں کرتی تھی اس نے کہا تھا ایک دو مہینے ٹھہر جاؤ۔۔۔سعیدہ کا بار بار اپنی ماں سے ملنے جانا۔۔۔۔اس کا ہر وقت خوفزدہ رہنا دوا کھانا اور خاص طور پر آج بہت

ہی زیادہ وحشت زدہ رہنا۔

باسط سارا معاملہ سمجھ گیا۔ سعیدہ پیٹ سے تھی جب وہ دلہن بن کر اس کے پاس آئی تھی اس کی ماں کی یہ کوشش تھی کہ حمل گر جائے چنانچہ آج وہ چیز ہو گئی باسط نے سوچا" کیا میں اوپر جاؤں جا کر سعیدہ کو دیکھوں۔۔۔۔۔اپنی ماں سے بات کروں"

ماں کا سوچا تو اس کو خیال آیا کہ وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکے گی وہ اپنے بیٹے کی آنکھوں میں ذلیل ہونا کبھی گوارا نہیں کرے گی ضرور کچھ کھا کر مر جائے گی وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا اپنے کمرے میں گیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

کئی بار اس کو سعیدہ کا خیال آیا کہ وہ خدا معلوم کس حالت میں ہو گی اس کے جسم پر اس کے دل و دماغ پر کیا کچھ بیتا ہو گا اور کیا بیت رہا ہو گا کیسے اتنا بڑا راز چھپائے گی کیا لوگ پہچان نہیں جائیں گے جوں جوں وہ سعیدہ کے بارے میں سوچتا اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ بڑھتا جاتا اس کو سعیدہ پر ترس آنے لگا" بے چاری معلوم نہیں بے ہوش پڑی ہے یا ہوش میں ہے ہوش میں بھی اس پر جانے کیا گزری ہو گی کیا وہ نیچے آ سکے گی؟"

تھوڑی دیر کے بعد وہ اٹھ کر صحن میں گیا تو سعیدہ نیچے آئی اس کا رنگ بے حد زرد تھا اتنا زرد کہ وہ بالکل مردہ معلوم ہوتی تھی اس سے بمشکل چلا جاتا تھا۔ ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں کمر میں جیسے جان ہی نہیں تھی باسط نے اس کو دیکھا تو اس پر بہت ترس آیا اندر سے برقع اٹھایا اور اس سے کہا" چلو میں تمہیں چھوڑ آؤں۔"

سعیدہ نے بہت ہمت سے کام لیا باسط کے ساتھ چل کر باہر سڑک تک گئی باسط نے تانگہ لیا اور اس کو اس کی ماں کے پاس چھوڑ آیا ماں نے اس سے پوچھا"

سعیدہ کہاں ہے؟"

باسط نے جواب دیا "ضد کرتی تھی میں اسے چھوڑ آیا ہوں"

باسط کی ماں نے اس کو ڈانٹا "بکواس کرتے ہو ضد کرنے دی ہوتی تم اسی طرح اس کی عادتیں خراب کرو گے اور پھر مجھ سے کہو گے کہ میں نے غلط جگہ تمہارا رشتہ کیا تھا۔"

باسط نے کہا "نہیں امی جان! سعیدہ بڑی اچھی لڑکی ہے"

اس کی ماں مسکرائی "میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ وہ بہت نیک لڑکی ہے تم اسے ضرور پسند کرو گے" پھر تھوڑی دیر چھالیا کاٹنے کے بعد ایک دم باسط سے مخاطب ہوئی "اور ہاں باسط یہ اوپر غسل خانے میں خون کیسا تھا"

باسط سٹپٹا گیا "وہ ۔۔۔۔ کچھ نہیں امی جان! میری نکسیر پھوٹی تھی"

ماں نے بڑے غصے کے ساتھ کہا "کم بخت گرم چیزیں نہ کھایا کرو ۔۔۔۔ جب دیکھو جیبیں مونگ پھلی سے بھری ہیں۔"

باسط کچھ دیر اپنی ماں کے ساتھ باتیں کرتا رہا وہ اٹھ کر کہیں گئی تو باسط اوپر غسل خانے میں گیا پانی ڈال کر اس کو اچھی طرح صاف کیا اس کے دل کو اس بات کا بڑا اطمینان تھا کہ اس نے اپنی ماں سے سعیدہ کے متعلق کوئی بات نہیں کی اور نہ اس نے سعیدہ پر یہ ظاہر ہونے دیا کہ وہ اس کا راز جانتا ہے۔

وہ دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ سعیدہ کا راز ہمیشہ اس کے سینے میں دفن رہے گا وہ کافی تکلیف اٹھا چکی تھی باسط کے خیال کے مطابق اس کو اپنے کیے کی سزا مل چکی تھی مزید سزا دینے کا کوئی فائدہ نہیں "خدا کرے وہ جلد تندرست ہو جائے اب

اس کے چہرے پر وہ الجھن پیدا کرنے والا خوف نہیں رہے گا" وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ نیچے سے اس کی ماں کی چیخ کی آواز آئی باسط لوٹا رکھ کر دوڑا نیچے گیا سب کمرے دیکھے ڈیوڑھی میں گیا تو اس کی ماں فرش پر اوندھی پڑی تھی، مردہ اس کے سامنے کوڑے والے لکڑی کے بکس میں ایک چھوٹا بہت ہی چھوٹا سا نامکمل بچہ کپڑے میں لپٹا پڑا تھا۔

باسط کو بے حد صدمہ ہوا اس نے پہلے اس بچے کو اٹھایا کپڑے میں اچھی طرح لپیٹا اور اندر جا کر بوٹ کے خالی ڈبے میں بند کر دیا پھر ماں کو اٹھا کر اندر چارپائی پر لٹایا اور اس کے سرہانے بیٹھ کر دیر تک روتا رہا۔

سعیدہ کو اطلاع پہنچی تو اس کو اپنی ماں کے ساتھ آنا پڑا وہ اسی طرح زرد تھی پہلے سے زیادہ نڈھال باسط کو بہت ترس آیا اس سے کہا "سعیدہ جو اللہ کو منظور تھا ہو گیا۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں رونا بند کرو اور جاؤ اندر لیٹ جاؤ"

اندر جانے کے بجائے سعیدہ ڈیوڑھی میں گئی جب واپس آئی تو اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا باسط خاموش رہا سعیدہ نے اس کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے یہ آنسو صاف بتا رہے تھے کہ وہ باسط کا شکریہ ادا کر رہی ہے۔۔۔باسط نے اس سے بڑے پیار سے کہا "زیادہ رونا اچھا نہیں سعیدہ! جو خدا کو منظور تھا ہو گیا"

دوسرے روز اس نے بچے کو نہر کے کنارے گڑھا کھود کو دفنا دیا۔

29 جولائی 1950ء



پھجنی

بھنگنوں کی باتیں ہو رہی تھیں خاص طور پر ان کی جو بٹوارے سے پہلے امرتسر میں رہتی تھیں مجید کا یہ ایمان تھا کہ امرتسر کی بھنگنوں جیسی کراری چھوکریاں اور کہیں نہیں پائی جاتیں خدا معلوم تقسیم کے بعد وہ کہاں تتر بتر ہو گئی تھیں۔

رشید ان کے مقابلے میں گجریوں کی تعریف کرتا تھا اس نے مجید سے کہا ''تم ٹھیک کہتے ہو کہ امرتسری بھنگنیں اپنی جوانی کے زمانے میں بڑی پرکشش ہوتی ہیں لیکن ان کی یہ جوانی کھترانیوں کی طرح زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی۔۔۔بس ایک دم جوان ہوتی ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ادھیڑ ہو جاتی ہیں۔۔۔۔۔۔ان کی جوانی معلوم نہیں کون سا چور چرا کے لے جاتا ہے خدا کی قسم۔۔۔ہمارے ہاں ایک بھنگن کوٹھا کمانے آتی تھی۔۔۔۔اتنی کڑیل جوان تھی کہ میں اپنی کمزور جوانی کو محسوس کر کے اس سے کبھی بات نہ کر سکا۔۔۔عیسائی مشنریوں نے اسے اپنے مذہب میں داخل کر لیا تھا نام اس کا فاطمہ تھا، پہلے گھر والے اسے پھاتو کہتے تھے۔۔۔مگر جب وہ عیسائی ہوئی تو اسے مس پھاتو کے نام سے پکارا جانے لگا۔۔۔۔صبح کو وہ برک فاسٹ کرتی تھی، دوپہر کو لنچ اور شام کو ڈنر۔۔۔۔۔لیکن چند مہینوں کے بعد میں نے اسے دیکھا کہ اس کی ساری کڑیل جوانی جیسے پگھل گئی ہے۔۔۔اس کی چھاتیاں جو بڑی تند خو تھیں اور اس طرح اوپر اٹھی رہتی تھیں جیسے ابھی اپنا سارا جوبن آپ پر داغ دیں گی، اس قدر نیچے ڈھلک گئی تھیں کہ ان کا نام و نشان بھی نہیں ملتا تھا۔۔۔لیکن اس کے مقابلے

میں ہمارے گھر میں وہ گجری جو اوپلے لے کر آتی تھی، تیر کی طرح سیدھی تھی اس کی عمر بھی اتنی ہی ہو گی جتنی اس بھنگن کی تھی۔۔۔۔ مگر وہ تین برس کے بعد بھی ویسی ہی جوان تھی۔۔۔۔۔ سرو قد۔۔۔۔۔ اوپلوں کا ٹوکرا اس کے سر پہ ہوتا تھا۔۔۔۔ ایک پہاڑ سا بنا ہوا مگر مجال ہے کہ اس کی گردن میں ہلکی سی جنبش آ جائے یا اس کی کمر میں خفیف سا خم آ جائے۔۔۔۔۔ تین برس وہ ہمارے یہاں آتی رہی۔ اس کے بعد اس کی شادی ہو گئی۔۔۔۔ اس کے یکے بعد دیگرے تین لڑکے پیدا ہوئے۔۔۔۔۔ اور مجید، میں خدا کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ اس کی کمر ویسی کی ویسی مضبوط تھی۔۔۔۔ تم میری مان لو کہ بھنگنیں گوجریوں کا مقابلہ کسی صورت بھی نہیں کر سکتیں"

مجید تلملا رہا تھا اس نے پان کی گلوری پندنیا سے نکال کر اپنے کلے میں دبائی چھوٹی ڈبیا سے ماچس کی تیلی کی مدد سے تھوڑا سا قوام نکالا اور منہ میں ڈال کر بڑے تحمل سے کہا "رشید بھائی۔۔۔۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔۔ لیکن جس بھنگن کا تصور میرے دماغ میں ہے اور جس کی دراصل میں بات کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ اس کی گرد کو امرتسر کی کوئی گجری نہیں پہنچ سکتی۔۔۔۔ وہ ایک قیامت تھی۔۔۔ ایک فتنا تھی۔۔۔ اب تم ایسا کرو کہ میری ساری داستان سن لو تا کہ تمہیں اس فتنہ و قیامت کے متعلق کچھ معلوم ہو سکے۔۔۔ جوبن ڈھلنے کی تم جو بات کرتے ہو اس کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں گجریوں کا قد لمبا ہوتا ہے قدرتی طور پر انہیں جلدی ڈھلنا چاہیے، مگر ایسا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ وہ ننگے پاؤں رہتی ہیں اور اپنے سر پہ بقول تمہارے پہاڑ سا اوپلوں کا ٹوکرا اٹھائے پھرتی ہیں۔۔۔۔۔ لیکن لعنت

بھجو فی الحال گجریوں پر، کیونکہ مجھے بچنی کی بات کرنا ہے جو ہمارے محلے کی بڑی کراری بھنگن تھی۔۔۔۔اس کا قد تو انگشتانہ بھر کا تھا مگر زبان اسکندری گز تھی شادی شدہ تھی مگر خاوند سے ہر روز لڑتی جھگڑتی رہتی تھی۔ ہمارے کمپاؤنڈ میں یہ دونوں میاں بیوی ہر روز صبح سویرے آتے اور ایک بڑ کے درخت کے ساتھ جھولا لٹکا دیتے اس میں وہ اپنا لڑکا ڈال دیتے تھے مگر مصیبت یہ تھی کہ اس کو جھلانے والا اور کوئی نہیں تھا، چنانچہ دونوں میاں بیوی جھاڑو چھوڑ کر اسے جھولا جھلاتے یا گود میں اٹھائے پھرتے تھے“

رشید نے مجید سے کہا ”یہ جھولے کی بات کہاں سے آ گئی ۔۔۔۔۔۔تم تو ایک کراری بھنگن کی بات کر رہے تھے۔۔۔۔جو بقول تمہارے بہت خوبصورت تھی۔“

مجید نے فوراً کہا ”یار تم جھولے کے ساتھ کیوں اٹک گئے ۔۔۔۔۔۔میری پوری کہانی تو سن لو۔۔۔۔۔۔یہ جھولے کی نہیں بچنی کی ہے۔۔۔اس بچنی کی جسے میں ساری عمر فراموش نہیں کر سکتا۔۔۔وہ ایک آفت تھی۔۔۔۔صبح اپنے خاوند کے ساتھ آتی تھی۔۔۔۔ہاتھ میں لمبی سی جھاڑو لیے۔۔۔۔۔ماتھے پر سینکڑوں تیوریاں۔۔۔۔ایسا معلوم ہوتا کہ ابھی جھاڑو آپ کے سر پر دے مارے گی۔۔۔۔۔مگر ایسا موقع کبھی نہیں آیا۔۔۔۔۔میں نے ہزاروں بار اس کو گھورا، لیکن اس نے میرے سر پر جھاڑو نہیں ماری۔۔۔۔اس کی تیوریاں اس کے ماتھے پر بدستور قائم رہیں اور وہ حسب سابق اپنا کام کرتی رہی۔اس کا خاوند جس کا نام معلوم نہیں کیا تھا، اول درجے کا زن مرید تھا۔ اس کا قد اپنی بیوی سے بھی چھوٹا

تھا۔وہ اس کو کام کے دوران میں ہمیشہ گالیاں دیا کرتی تھی ۔۔۔محلے کے سب لوگ سنتے تھے اور آپس میں چہ میگوئیاں کرتے تھے۔''

رشید اتنی لمبی داستان سنا کر بھنا گیا ''تم اصل بات کی طرف آؤ۔۔۔یہ کیا تم بے گوئیاں بک رہے ہو۔۔۔۔۔بچنی نام بڑا اچھا ہے، ورنہ خدا کی قسم، میں تمہاری یہ خرافات کبھی نہ سنتا۔۔۔معلوم نہیں، یہ تمہاری جوڑی ہوئی کہانی ہے۔۔۔۔بہر حال تمہیں چند منٹ دیتا ہوں۔۔۔۔سنالو''

مجید تاؤ میں آگیا ''الو کے پٹھے۔۔۔تم نے صرف بچنی کا نام سنا ہے، کبھی تم نے اسے دیکھا ہوتا تو دل نکال کر اس کے ٹوکرے میں ڈال دیا ہوتا۔۔۔میں تم سے اگر ایک واقعہ بیان کر رہا ہوں تو اس میں نمک مرچ لگانے کی مجھے اجازت ہونی چاہیے۔۔۔۔تم اگر اکتا گئے ہو تو جہنم میں جاؤ!''

رشید کو اور کوئی کام نہیں تھا۔۔۔۔۔اس کے پاس اتنی رقم بھی نہیں تھی کہ کسی سینما میں چلا جاتا اس لیے مناسب سمجھا کہ مجید کی داستان سن لے ''جہنم میں جانے کا سوال نہیں۔۔۔تم ذرا اختصار سے کام لو۔۔۔۔اصل میں مجھے بچنی سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔''

مجید غصے میں آگیا ''تمہاری دلچسپی کی ایسی کی تیسی۔۔۔۔۔سالے، تم کون ہوتے ہو، اس میں دلچسپی لینے والے۔۔۔اس میں دلچسپی لینے والے تم ایسے ہزاروں تھے، مگر وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔۔۔۔۔میں تم سے کروڑ مرتبہ زیادہ خوبصورت ہوں، لیکن میں اس کی نگہ التفات کا ہر وقت منتظر رہتا تھا۔۔۔وہ بڑی ہٹیلی تھی۔۔۔میرے دوست رشید! خدا کی قسم، اس جیسی لڑکی،

میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی نام اس کا پچنی تھا۔۔۔۔یعنی بچن سے تعلق رکھتا تھا۔۔مگر وہ تو پھاپھا کٹنی تھی۔۔۔۔میں نے بڑی کوشش کی کہ اس کو اپنے قبضے میں لے آؤں، پرنا کام رہا وہ پٹھے پر ہاتھ ہی نہیں دھرنے دیتی تھی۔"

یہ سن کر رشید بولا "تم یار ہمیشہ ایسے معاملوں میں کورے رہے ہو"

مجید کے گہری چوٹ لگی "بکواس کرتے ہو۔۔۔۔۔۔میں نے ایک روز اسے پکڑ لیا۔۔۔۔میرے گھر کے باہر وہ جھاڑو دے رہی تھی کہ میں نے اس کا بازو پکڑ لیا اور اپنے ساتھ چمٹا لیا۔"

"پھر کیا ہوا؟" رشید نے ازراہ مذاق سگریٹ سلگایا اور ماچس کی تیلی بجھا کر اس کے کئی ٹکڑے کر کے ایش ٹرے میں ڈال دیئے۔

مجید کو ایسا معلوم ہوا، کہ رشید نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں، بہت جز بز ہوا لیکن آدمی سچا تھا اس لیے جھوٹ نہ بول سکا "یار رشید! تم مذاق اڑاتے ہو۔۔۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ اس روز ہوا، اس کا مذاق اڑانا ہی چاہیے۔۔۔۔میں نے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔۔۔۔۔لیکن اس حرامزادی نے کھینچ کے اپنی جھاڑو میرے منہ پر دے ماری۔میں شرم کے مارے اندر بھاگ گیا۔۔۔۔لیکن فوراً باہر نکلا۔۔۔۔دیکھا کہ وہ میرے مکان کے باہر جھاڑو دے رہی ہے۔۔۔میں نے اسے پھر پکڑا۔۔۔اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔۔۔میں نے سوچا۔۔۔"

رشید نے مجید کا فقرہ مکمل کر دیا "کہ معاملہ درست ہو گیا ہے"

مجید بوکھلا گیا "خاک درست ہوا۔۔۔۔۔وہ میری گرفت سے نکل کر سیدھی

میری بیوی کے پاس چلی گئی۔۔۔لیکن اس سے کوئی شکایت نہ کی۔۔۔میں ڈر کے مارے دبکا ہوا تھا۔۔۔میں نے صرف یہ سنا، اور میری جان کا بوجھ ہلکا ہوا۔۔۔"بی بی جی، آج بھی پانی نہیں آیا۔۔۔یہ ان لوگوں کو جو آپ سے ہر مہینے دس روپے وصول کرتے ہیں، کیا ہو گیا ہے۔۔۔کیوں وہ اتنا خیال نہیں کرتے کہ آپ کو ہر روز ماشکی کو دس مشکوں کے چار آنے فی مشک کے حساب سے دو روپے آٹھ آنے دینا پڑیں۔۔۔۔میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے میری عزت و آبرو رکھ لی۔۔۔لیکن میں نے بعد میں سوچا کہ میری عزت آبرو رکھنے والی اصل میں پچنی ہے۔۔۔لیکن جب زیادہ سوچا تو احساس ہوا کہ ایسا سوچنا کفر ہے۔

رشید قریب قریب تنگ آ چکا تھا اس نے اپنے دوست کی خاطر آواز دبا کر کہا "کافر کے بچے۔۔۔بات تو کر یہ کہ تیرا اس پچنی کی بچی سے کیا ہوا؟۔۔۔کیا تم نے اسے پٹا لیا؟"

مجید نے رشید کی پندنیا سے ایک گلوری لی اور کہا "دیکھو رشید۔۔۔۔۔تم پچنی کو جانتے نہیں۔۔۔افسوس ہے کہ میں افسانہ نگار نہیں ورنہ میں اس کا کردار بہت اچھی طرح۔۔۔جیتا جاگتا پیش کر سکتا۔۔۔۔۔وہ معلوم نہیں ہے، کیا تھی۔۔۔۔عمر اس کی زیادہ سے زیادہ۔۔۔یہ سمجھو کہ سترہ اٹھارہ برس کے قریب ہو گی۔۔۔قد اس کا ساڑھے چار فٹ ہو گا۔۔۔چھاتی ایسی تھی جیسے لوہے کی بنی ہے حالانکہ ایک بچے کی ماں تھی"

رشید بہت تنگ آ گیا "ایک بچے کی ماں کے بچے۔۔۔تو اپنی داستان کے

انجام کو پہنچے۔۔مجھے ایک بہت ضروری کام سے جانا ہے۔۔۔ساڑھے سات بج چکے ہیں، لیکن تمہاری داستان ہی ختم ہونے میں نہیں آتی“

مجید سنجیدہ رہا ”رشید لالے!۔۔۔۔معاملہ بڑا نازک ہے“

”کس کا؟۔۔۔تمہارا یا میرا؟“

”میں نہیں کہہ سکتا، لیکن جس وقت کی میں بات کر رہا ہوں، اس وقت معاملہ میرا تو بہت نازک تھا۔۔۔۔سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیا کروں، کیا نہ کروں۔۔۔۔اب تم یہ خیال کرو کہ میں ہزاروں کا مالک تھا۔۔۔۔تم جانتے ہی ہو کہ ماں باپ مر کھپ چکے تھے۔۔۔۔ساری جائیداد کا میں وارث تھا جہاں چاہتا لٹا دیتا۔۔۔۔اس روز جب میں نے بچی کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچا اور وہ میری گرفت سے یوں الگ ہٹی، جیسے میرا کام تمام کر دے گی لیکن میری بیوی سے اس نے اس سلسلے کا ذکر تک نہ کیا تو مجھے امید ہو گئی کہ چند ایسے معاملوں کے بعد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔“

رشید نے اس سے پوچھا ”تجھے کامیابی ہوئی“

”خاک۔۔۔تم اسے جانتے ہی نہیں ہو۔۔۔۔۔۔بڑی تیز خو لڑکی ہے۔۔۔۔اپنے خاوند کو کچھ نہیں سمجھتی۔۔۔۔۔لیکن ایک عجیب بات ہے کہ میں نے اس سے اتنی چھیڑ چھاڑ کی، لیکن اس نے کسی سے بات تک نہ کی، ورنہ اگر وہ چاہتی تو میرا گھر نکالا کر سکتی تھی“

رشید مسکرایا ”میں تمہاری بچی کو جانتا ہوں“

مجید نے بڑی حیرت سے پوچھا ”تم کیسے جانتے ہو اس کو؟“

’’جس طرح تم جانتے ہو۔۔۔۔۔کیا تم نے ٹھیکا لے رکھا ہے کہ وہ تمہارے ہی محلے میں کام کیا کرے۔۔میں اس کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں‘‘

مجید کو یقین نہ آیا’’ بکواس کرتے ہو۔۔اس کی عمر ہی کتنی ہے کہ تم اسے جانو۔۔۔۔۔دو برس سے کچھ مہینے اوپر ہو گئے ہیں کہ وہ ہمارے محلے میں روزانہ آتی ہے اس کے لڑکے کی عمر بھی دو سال کے قریب ہو گی۔۔۔یعنی جب وہ ہمارے ہاں ملازم ہوئی تو اس کے کوئی بچہ نہیں تھا۔۔۔لیکن دو تین مہینے کے بعد اس کی گود میں ایک لڑکا تھا۔‘‘

رشید پھر مسکرایا’’تمہارا؟‘‘

’’میرا؟‘‘مجید گھبرا گیا،لیکن فوراً سنبھل کر اس نے مذاق کا جواب مذاق میں دیا’’میرا ہوتا تو کیا کہنے تھے۔۔۔کم از کم میں یہ تو کہنے کے قابل ہو جاتا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں۔‘‘

رشید کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب رنگ اختیار کر گئی’’تمہیں اپنی بچنی کے شوہر کا نام معلوم نہیں‘‘

’’نہیں!‘‘

’’میں بتاتا ہوں تمہیں۔۔۔۔اس کے شوہر کا نام رشید ہے!‘‘

مجید بوکھلا گیا’’رشید؟۔۔۔۔کیا اس کا نام رشید ہے؟‘‘

رشید نے بڑے وثوق اور بڑی سنجیدگی سے جواب دیا’’ہاں اس کا نام رشید ہے۔۔۔اصل میں وہی اس کا شوہر ہے‘‘

’’وہ جو اس کے ساتھ ہمارے محلے میں جھاڑو دیتا ہے اور اپنے بچے کو جھولا

جھلاتا ہے" مجید کی بوکھلاہٹ اسی طرح قائم تھی

رشید کی سنجیدگی میں کچھ اضافہ ہو گیا "وہ الو کا پٹھا اپنے بچے کو جھولا نہیں جھلاتا"

"تو کسے جھلاتا ہے۔۔۔کیا وہ اس رشید کا بچہ نہیں؟"

"نہیں!"

"تو کس کا بچہ ہے؟"

"ایک بہت غریب اور نادار آدمی کا۔۔۔جو خوبصورت بھی نہیں۔۔۔تم سے ہزاروں درجے نیچے ہے"

"کون ہے وہ؟"

"پوچھ کے کیا کرو گے؟"

"کروں گا کیا۔۔۔بس ایسے ہی جاننا چاہتا ہوں"

رشید نے ایک سگریٹ سلگایا اور بڑے اطمینان سے کہا" جاننا چاہتے ہو تو جان لو۔۔وہ رشید میں ہوں۔۔۔تمہاری پھپھی سے میری آشنائی بچپن کی ہے۔۔۔وہ گیارہ برس کی تھی۔۔۔میں تیرہ برس کا۔۔۔جب سے میرا اس کا معاملہ چلا آرہا ہے۔۔۔وہ لڑکا جو تم اس کی گود میں دیکھتے ہو اور جسے اس کا الو کا پٹھا شوہر ہر روز جھولا جھلاتا ہے، اس خاکسار کی اولاد ہے۔۔۔شکر ہے خداوند کریم کا کہ لڑکی نہ ہوئی، ورنہ میں تو اسے دوسرے ہی روز مار ڈالتا۔۔۔۔"

یہ کہہ کر رشید فوراً اٹھا اور چلا گیا۔۔۔مجید سوچتا رہ گیا کہ خداوند کریم نے اس پر کون سا کرم کیا تھا جو وہ اس کا شکر گزار تھا۔۔۔۔۔۔!

☆☆☆☆☆

بسم اللہ

فلم بنانے کے سلسلے میں ظہیر سے سعید کی ملاقات ہوئی سعید بہت متاثر ہوا بمبئی میں اس نے ظہیر کو سنٹرل اسٹوڈیوز میں ایک دو مرتبہ دیکھا تھا اور شاید چند باتیں بھی کی تھیں مگر مفصل ملاقات پہلی مرتبہ لاہور ہی میں ہوئی۔

لاہور میں یوں تو بے شمار فلم کمپنیاں تھیں مگر سعید کو اس تلخ حقیقت کا علم تھا کہ ان میں سے اکثر کا وجود صرف ان کے نام کے بورڈوں تک ہی محدود ہے۔ ظہیر نے جب اس کو اکرم کی معرفت بلایا تو اس کو سو فیصدی یقین تھا کہ ظہیر بھی دوسرے فلم پروڈیوسروں کی طرح کھوکھلا ہے جو لاکھوں کی باتیں کرتے ہیں آفس قائم کرتے ہیں کرائے پر فرنیچر لاتے ہیں اور آخر میں آس پاس کے ہوٹلوں کے بل مار کر بھاگ جاتے ہیں۔

ظہیر نے بڑی سادگی سے سعید کو بتایا کہ وہ کم سے کم سرمائے سے فلم بنانا چاہتا ہے۔ بمبئی میں وہ اسٹنٹ فلم بنانے والے ڈائریکٹر کا اسسٹنٹ تھا۔ پانچ برس تک وہ اس کے ماتحت کام کرتا رہا اس کو خود فلم بنانے کا موقع ملنے ہی والا تھا کہ ہندوستان تقسیم ہو گیا اور اسے پاکستان آنا پڑا۔ یہاں وہ تقریباً ڈھائی سال بیکار رہا مگر اس دوران میں اس نے چند آدمی ایسے تیار کر لیے جو روپیہ لگانے کے لیے تیار ہیں۔ اس نے سعید سے کہا "دیکھئے جناب! میں کوئی فرسٹ کلاس فلم بنانا نہیں چاہتا۔ کم علم آدمی ہوں اسٹنٹ فلم بنا سکتا ہوں اور انشاءاللہ اچھا اسٹنٹ فلم بناؤں گا پچاس ہزار روپوں کے اندر اندر سو فیصدی نفع تو یقینی ہے۔۔۔۔۔ آپ کا کیا خیال

ہے؟''

سعید نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا ''ہاں اتنا نفع تو ہونا چاہیے''

ظہیر نے کہا ''جو آدمی روپیہ لگانے کے لیے تیار ہیں میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ حساب کتاب سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہو گا یہ آپ کا کام ہے۔۔۔باقی سب چیزیں میں سنبھال لوں گا۔''

سعید نے پوچھا ''مجھ سے آپ کیا خدمت چاہتے ہیں''

ظہیر نے بڑی سادگی سے کہا ''پاکستان کے تقریباً تمام ڈسٹری بیوٹر آپ کو جانتے ہیں میری یہاں ان لوگوں سے واقفیت نہیں بڑی نوازش ہو گی اگر آپ میرے فلم کی ڈسٹری بیوشن کا بندوبست کر دیں۔''

سعید نے کہا ''آپ فلم تیار کر لیں انشاءاللہ ہو جائے گا''

''آپ کی بڑی مہربانی ہے'' یہ کہہ کر ظہیر نے میز پر پڑے ہوئے پیڈ پر پنسل سے ایک پھول سا بنایا ''سعید صاحب! مجھے سو فیصدی یقین ہے کہ میں کامیاب رہوں گا۔۔۔ہیروئن میری بیوی ہو گی۔''

سعید نے پوچھا ''آپ کی بیوی؟''

''جی ہاں''

''پہلے کسی فلم میں کام کر چکی ہیں''

''جی نہیں'' ظہیر نے پیڈ پر پھول کے ساتھ شاخ بناتے ہوئے کہا ''میں نے شادی یہاں لاہور میں آ کر کی ہے۔۔۔میرا ارادہ تو نہیں تھا کہ اسے فلم لائن میں لاؤں مگر اس کو شوق ہے۔۔۔بہت شوق ہے ہر روز ایک فلم دیکھتی

ہے۔۔۔۔۔میں آپ کو اس کا فوٹو دکھاتا ہوں۔''

ظہیر نے میز کا دراز کھول کر ایک لفافہ نکالا اور اس میں سے اپنی بیوی کا فوٹو سرکا کر سعید کی طرف بڑھا دیا۔

سعید نے فوٹو دیکھا معمولی خدوخال کی جوان عورت تھی تنگ ماتھا، باریک ناک موٹے موٹے ہونٹ آنکھیں بڑی بڑی اور اداس۔

یہ آنکھیں ہی تھیں جو اس کے چہرے کے دوسرے خطوط کے مقابلے میں سب سے نمایاں تھیں سعید نے غور سے ان کو دیکھنا چاہا مگر معیوب سمجھا اور فوٹو میز پر رکھ دیا

ظہیر نے پوچھا ''کیا خیال ہے آپ کا؟''

سعید کے پاس اس سوال کا جواب تیار نہیں تھا اس کے دل و دماغ پر دراصل وہ آنکھیں چھائی ہوئی تھیں بڑی بڑی اداس آنکھیں، غیر ارادی طور پر اس نے میز پر سے فوٹو اٹھایا اور ایک نظر دیکھ کر پھر وہیں رکھ دیا اور کہا ''آپ زیادہ بہتر جانتے ہیں''

ظہیر نے پیڈ پر ایک اور پھول بنانا شروع کیا ''یہ فوٹو اچھی نہیں۔۔۔۔۔ذرا سی ہلی ہوئی ہے۔''

اتنے میں پچھلے دروازے کا پردہ ہلا اور ظہیر کی بیوی داخل ہوئی۔۔۔۔وہی بڑی بڑی اداس آنکھیں ظہیر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا ''عجیب وغریب نام ہے اس کا۔۔۔۔'' بسم اللہ! پھر سعید کی طرف اشارہ کیا ''یہ میرے دوست سعید صاحب ہیں''

بسم اللہ نے کہا ’’آداب عرض‘‘

سعید نے اس کا جواب اٹھ کر دیا ’’تشریف رکھیے‘‘

بسم اللہ دوپٹہ ٹھیک کرتی سعید کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گئی ہلکے پیازی رنگ کے کلف لگے ململ کے مہین دوپٹے کے پیچھے اس کے سینے کا ابھار چغلیاں کھا رہا تھا۔ سعید نے اپنی نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں۔

ظہیر نے فوٹو واپس لفافے میں رکھا اور سعید سے کہا ’’مجھے سو فیصدی یقین ہے کہ بسم اللہ پہلے ہی فلم میں کامیاب ثابت ہو گی لیکن سمجھ میں نہیں آتا، اس کا فلمی نام کیا رکھوں۔ بسم اللہ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا کیا خیال آپ کا۔‘‘

سعید نے بسم اللہ کی طرف دیکھا اس کی بڑی بڑی اداس آنکھوں میں وہ ایک لحظے کے لیے جیسے ڈوب سا گیا۔ فوراً ہی نگاہ اس طرف سے ہٹا کر اس نے ظہیر سے کہا ’’جی ہاں۔۔۔۔۔ بسم اللہ ٹھیک نہیں ہے کوئی اور نام ہونا چاہیے۔‘‘

تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ بسم اللہ خاموش تھی اس کی بڑی بڑی اداس آنکھیں بھی خاموش تھیں۔ سعید نے اس دوران میں ان آنکھوں کے اندر کئی بار ڈبکیاں لگائیں ظہیر اور وہ دونوں باتیں کرتے رہے بسم اللہ خاموش بیٹھی اپنی بڑی بڑی اداس آنکھوں پر چھائی ہوئی سیاہ پلکیں جھپکاتی اس کے ہلکے پیازی رنگ کے کلف لگے ململ کے دوپٹے کے پیچھے اس کے سینے کا ابھار برابر چغلیاں کھاتا رہا۔ سعید ادھر دیکھتا ایک دھکے کے ساتھ اس کی نظریں دوسری طرف پلٹ جاتیں۔

بسم اللہ کا رنگ گہرا سانولا تھا فوٹو میں اس رنگت کا پتا نہیں چلتا تھا اس گہرے

سانولے رنگ پر اس کی بڑی بڑی کالی آنکھیں اور بھی زیادہ اداس ہو گئی تھیں سعید نے کئی مرتبہ سوچا کہ اس اداسی کا باعث کیا ہے۔۔۔۔ان کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ اداس دکھائی دیتی ہیں یا کوئی اور وجہ ہے کوئی معقول بات سعید کے ذہن میں نہ آئی۔

ظہیر بمبئی کی باتیں شروع کرنے والا تھا کہ بسم اللہ اٹھی اور چلی گئی اس کی چال میں بے ڈھنگا پن تھا جیسے اس نے اونچی ایڑھی کے چپل نئے نئے استعمال کرنے شروع کیے ہیں۔غرارے کی نشست بھی ٹھیک نہیں تھی سلوٹوں کا گراؤ بھدا تھا اس کے علاوہ سعید نے یہ بھی محسوس کیا کہ ادب آداب سے بسم اللہ محض کوری ہے۔۔۔۔لیکن اس کے گہرے سانولے چہرے پر دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اداس ہونے کے باوجود کس قدر جذبات انگیز تھیں۔

چند ہی ملاقاتوں میں ظہیر سے سعید کے تعلقات بہت گہرے ہو گئے ظہیر بے حد سادہ دل تھا اس خاص چیز سے سعید بہت متاثر ہوا تھا اس کی کسی بھی بات میں بناوٹ نہیں ہوتی تھی خیال جس شکل میں پیدا ہوتا تھا سادہ الفاظ میں تبدیل ہو کر اس کی زبان پر آجاتا تھا کھانے پینے اور رہنے سہنے کے معاملے میں بھی وہ سادگی پسند تھا۔

جب بھی سعید اس کے یہاں جاتا ظہیر اس کی خاطر تواضع کرتا سعید نے اس سے کئی بار کہا کہ تم یہ تکلف نہ کیا کرو مگر وہ نہ مانا وہ اکثر کہا کرتا ”اس میں کیا تکلف ہے آپ کا اپنا گھر ہے۔“

سعید نے جب تقریباً ہر روز ظہیر کے ہاں جانا شروع کیا تو اس نے سوچا کہ یہ

بہت بری بات ہے وہ میری اتنی عزت کرتا ہے مجھے اپنا دوست سمجھتا ہے اور میں اس سے صرف اس لیے ملتا ہوں کہ مجھے اس کی بیوی سے دلچسپی ہو گئی ہے یہ بہت بری بات ہے۔

اس کے ضمیر نے کئی دفعہ اسے ٹوکا مگر وہ برابر ظہیر کے ہاں جاتا رہا۔

بسم اللہ اکثر آ جاتی تھی شروع شروع میں خاموش بیٹھی رہتی پھر آہستہ آہستہ اس نے باتوں میں حصہ لینا شروع کر دیا لیکن گفتگو کے لحاظ سے وہ خام تھی سعید کو دکھ ہوتا تھا کہ وہ اچھی باتیں کرنا کیوں نہیں جانتی۔

کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ ظہیر گھر سے باہر تھا سعید نے آواز دی تو بسم اللہ بولی "باہر گئے ہوئے ہیں" یہ سن کر کچھ دیر کھڑا رہا کہ شاید وہ اس سے کہے، اندر آ جائیے ابھی آتے ہیں مگر ایسا نہ ہوا۔

ظہیر کے فلم کا چکر چل رہا تھا اس کا ذکر قریب قریب ہر روز ہوتا ظہیر کہتا مجھے اتنی جلدی نہیں ہے ہر ایک چیز آرام سے ہو گی اور اپنے وقت پر ہو گی۔

سعید کو ظہیر کے فلم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس کو اگر دلچسپی تھی تو بسم اللہ سے جس کی بڑی بڑی اداس آنکھوں میں وہ کئی بار غوطے لگا چکا تھا اور اس کی یہ دلچسپی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی جس کا احساس اس کے لیے بہت تکلیف دہ تھا کیونکہ یہ کھلی ہوئی بات تھی کہ وہ اپنے دوست ظہیر کی بیوی سے جسمانی رشتہ پیدا کرنے کا خواہاں تھا۔

دن گزرتے گئے ظہیر کے فلم کا کام وہیں کا وہیں تھا۔ سعید ایک دن اس سے ملنے گیا تو وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا چلنے ہی والا تھا کہ بسم اللہ نے کہا "اندر آ جائیے وہ

کہیں دور نہیں گئے''

سعید کا دل دھڑکنے لگا کچھ توقف کے بعد وہ کمرے میں داخل ہوا اور کرسی پر بیٹھ گیا بسم اللہ میز کے پاس کھڑی تھی سعید نے جرأت سے کام لے کر اس سے کہا'' بیٹھیے''

بسم اللہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی تھوڑی دیر خاموش رہی اس کے بعد سعید نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا''ظہیر آئے نہیں ابھی تک؟''

بسم اللہ نے مختصر جواب دیا'' آجائیں گے''

تھوڑی دیر پھر خاموشی رہی اسی دوران میں کئی مرتبہ سعید نے بسم اللہ کی آنکھوں کی طرف دیکھا اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اٹھ کر ان کو چومنا شروع کر دے اس قدر چومے کہ ان کی ساری اداسی دھل جائے مگر سعید نے اس خواہش پر قابو پا کر اس سے کہا'' آپ کو فلم میں کام کرنے کا بہت شوق ہے؟''

بسم اللہ نے ایک جمائی لی اور جواب دیا'' ہے تو سہی''

سعید ناصح بن گیا'' یہ لائن اچھی نہیں میرا مطلب ہے بڑی بدنام ہے'' اس کے بعد اس نے فلم لائن کی تمام برائیاں بیان کرنا شروع کر دیں ظہیر کا خیال آیا تو اس نے رخ بدل لیا'' آپ کو شوق ہے تو خیر دوسری بات ہے کیریکٹر مضبوط ہو تو آدمی کسی بھی لائن میں ثابت قدم رہ سکتا ہے پھر ظہیر خود اپنا فلم بنا رہا ہے لیکن آپ کسی دوسرے کے فلم میں کام ہرگز نہ کیجئے گا۔''

بسم اللہ خاموش رہی سعید کو اس کی یہ خاموشی بہت بری معلوم ہوئی پہلی مرتبہ اس کو تنہائی میں اس سے ملنے کا موقع ملا تھا مگر وہ بولتی ہی نہیں تھی سعید نے

ایک دو مرتبہ ڈرتے ڈرتے ٹوہ لینے والی نگاہوں سے اسے دیکھا مگر کوئی ردعمل پیدا نہ ہوا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوا" اچھا تو پان ہی کھلائیے"

بسم اللہ اٹھی ریشمی قمیص کے پیچھے اس کے سینے کا نمایاں ابھار ہلا سعید کی نگاہوں کو دھکا سا لگا بسم اللہ دوسرے کمرے میں گئی تو وہ ڈرڈر کے تیکھی تیکھی باتیں سوچنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ پان لے کر آئی اور سعید کے پاس کھڑی ہوگئی" لیجئے"

سعید نے شکریہ کہہ کر پان لیا تو اس کی انگلیاں بسم اللہ کی انگلیوں سے چھوئیں اس کے سارے بدن میں برقی لہر دوڑ گئی اس کے ساتھ ہی ضمیر کا کانٹا اس کے دل میں چبھا۔

بسم اللہ سامنے کرسی پر بیٹھ گئی اس کے گہرے سانولے چہرے سے سعید کو کچھ پتہ نہیں چلتا تھا سعید نے سوچا کوئی اور عورت ہوتی تو فوراً سمجھ جاتی کہ میں اسے کن آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، لیکن شاید سمجھ گئی ہو شاید یہ بھی ممکن ہو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

سعید کا دماغ بے حد مضطرب تھا ایک طرف بسم اللہ کا ستانے والا وجود تھا اس کی بڑی بڑی اداس آنکھیں اس کے سینے کا نمایاں ابھار، دوسری طرف ظہیر کا خیال، اس کے ضمیر کا کانٹا، سب عجیب الجھن میں پھنس گیا تھا۔ بسم اللہ کی طرف سے کوئی اشارہ نہیں ملتا تھا اس کا مطلب صاف تھا کہ جو چیز سعید سوچ رہا ہے ناممکن ہے مگر وہ پھر بھی اس کو انہی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوا "ظہیر نہیں آئے میرا خیال ہے میں چلتا ہوں"

بسم اللہ نے خلاف توقع کہا "نہیں نہیں بیٹھیے"

"آپ تو کوئی بات ہی نہیں کرتیں" یہ کہہ کر سعید اٹھا

بسم اللہ نے پوچھا "چلے؟"

سعید نے اس کی طرف ٹوہ لینے والی نگاہوں سے دیکھا "جی نہیں بیٹھتا ہوں آپ کو اگر کوئی اعتراض نہ ہو"

بسم اللہ نے ایک جمائی لی "مجھے کیا اعتراض ہوگا"

بسم اللہ کی آنکھوں میں خمار سا پیدا ہو گیا سعید نے کہا "آپ کو شاید نیند آ رہی ہے۔"

"جی ہاں رات جاگتی رہی"

سعید نے ذرا بے تکلفی سے پوچھا "کیوں؟"

بسم اللہ نے ایک اور جمائی لی "کہیں باہر گئے ہوئے تھے"

سعید بیٹھ گیا تھوڑی دیر کے بعد بسم اللہ سو گئی اس کے سینے کا نمایاں ابھار ریشمی قمیض کے پیچھے سانس کے زیر و بم سے ہولے ہولے ہل رہا تھا بڑی بڑی اداس آنکھیں اب بند تھیں دایاں بازو ایک طرف ڈھلک گیا تھا آستین اوپر کو اٹھ گئی تھی سعید نے کہا گہرے سانولے رنگ کی کلائی پر ہندی کے حروف کھدے ہوئے تھے اتنے میں ظہیر آ گیا۔

سعید اس کی آمد پر سٹپٹا سا گیا ظہیر نے اس سے ہاتھ ملایا اپنی بیوی بسم اللہ کی

طرف دیکھا ''ارے سو رہی ہے''

سعید نے کہا ''میں جا رہا تھا کہنے لگیں ظہیر صاحب ابھی آ جائیں گے آپ بیٹھیے میں بیٹھا تو آپ سو گئیں''

ظہیر ہنسا، سعید بھی ہنسنے لگا

''بھئی واہ۔۔۔۔اٹھو اٹھو'' ظہیر نے بسم اللہ کے سر پر ہاتھ پھیرا

بسم اللہ نے ایک لمبی آہ بھری اور اپنی بڑی بڑی اداس آنکھیں کھول دیں اداسی کے ساتھ ساتھ اب ان میں ویرانی سی بھی تھی۔

''چلو چلو۔۔۔۔۔۔اٹھو ایک ضروری کام پر جانا ہے'' بسم اللہ سے یہ کہہ کر ظہیر سعید سے مخاطب ہوا ''معاف کیجئے گا سعید صاحب میں ایک کام سے جا رہا ہوں انشاء اللہ کل ملاقات ہوگی۔''

سعید چلا گیا دوسرے روز اس نے ظہیر کے ہاں جانے سے پہلے یہ دعا مانگی کہ وہ گھر پر نہ ہو وہاں پہنچا تو باہر کئی آدمی جمع تھے سعید کو ان سے معلوم ہوا کہ بسم اللہ ظہیر کی بیوی نہیں تھی وہ ایک ہندو لڑکی تھی جو فسادوں میں یہاں رہ گئی تھی ظہیر اس سے پیشہ کراتا تھا پولیس ابھی ابھی اسے برآمد کر کے لے گئی ہے۔

وہ بڑی بڑی سیاہ اور اداس آنکھیں اب بھی سعید کا پیچھا کرتی رہتی ہیں۔



بغیر اجازت

نعیم ٹہلتا ٹہلتا ایک باغ کے اندر چلا گیا۔۔۔اس کو وہاں کی فضا بہت پسند آئی۔۔۔گھاس کے ایک تختے پر لیٹ کر اس نے خود کلامی شروع کر دی۔

"کیسی پر فضا جگہ ہے۔۔۔۔حیرت ہے کہ آج تک میری نظروں سے اوجھل رہی۔۔۔نظریں۔۔۔اوجھل"

اتنا کہہ کر وہ مسکرایا

"نظر ہو تو چیزیں نظر بھی نہیں آتیں۔۔۔آہ کہ نظر کی بے نظری!"

دیر تک وہ گھاس کے اس تختے پر لیٹا اور ٹھنڈک محسوس کرتا رہا لیکن اس کی خود کلامی جاری تھی۔

"یہ نرم نرم گھاس کتنی فرحت ناک ہے"

آنکھیں پاؤں کے تلووں میں چلی آئیں۔۔۔اور یہ پھول۔۔۔یہ پھول اتنے خوبصورت نہیں جتنی ان کی ہرجائی خوشبو ہے۔۔۔ہر شے جو ہرجائی ہو۔۔۔خوبصورت ہوتی ہے۔۔۔ ہرجائی عورت۔۔۔۔۔ہرجائی مرد۔۔کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔یہ خوبصورت چیزیں پہلے پیدا ہوئی تھیں۔۔یا خوبصورت خیال۔۔۔۔۔ہر خیال خوبصورت ہوتا ہے۔۔۔۔مگر مصیبت یہ ہے کہ ہر پھول خوبصورت نہیں ہوتا۔۔۔۔مثال کے طور پر یہ پھول، اس نے اٹھ کر ایک پھول کی طرف دیکھا اور اپنی خود کلامی جاری رکھی۔

یہ اس ٹہنی پر اکڑوں بیٹھا ہے۔۔۔کتنا سفلہ دکھائی دیتا ہے بہر حال یہ جگہ

خوب ہے ۔۔۔ ایک بہت بڑا دماغ معلوم ہوتی ہے ۔۔۔ روشنی بھی ہے ۔۔۔ سائے بھی ہیں ۔۔۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت میں نہیں بلکہ یہ جگہ سوچ رہی ہے۔

یہ پرفضا جگہ جو اتنی دیر میری نظروں سے اوجھل رہی۔

اس کے بعد نعیم فرط مسرت میں کوئی غزل گانا شروع کر دیتا ہے ۔۔۔۔ کہ اچانک موٹر کے ہارن کی کرخت آواز اس کے ساز دل کے سارے تار جھنجھوڑ دیتی ہے۔

وہ چونک کر اٹھتا ہے ۔۔۔۔ دیکھتا ہے کہ ایک موٹر پاس کی روش پر کھڑی ہے اور ایک لمبی لمبی مونچھوں والا آدمی اس کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہا ہے ۔۔۔۔ اس مونچھوں والے آدمی نے گرج کر کہا۔

''اے تم کون ہو ۔۔۔۔''

نعیم جو اپنے ہی نشہ میں سرشار تھا چونکا ۔۔۔

''یہ موٹر اس باغ میں کہاں سے آ گئی''

مونچھوں والا جو اس باغ کا مالک تھا بڑبڑایا

وضع قطع سے تو آدمی شریف معلوم ہوتا ہے مگر یہاں کیسے گھس آیا ۔۔۔ کس اطمینان سے لیٹا تھا جیسے اس کے باوا کا باغ ہے ۔۔۔ پھر اس نے بلند آواز میں للکار کے نعیم سے کہا

''اماں ۔۔۔۔ کچھ سنتے ہو ۔۔۔''

نعیم نے جواب دیا

''حضور سن رہا ہوں۔۔۔تشریف لے آیئے۔۔۔یہاں بہت پر فضا جگہ ہے۔''

باغ کا مالک بھنا گیا

''تشریف کا بچہ۔۔۔ادھر آؤ''

نعیم لیٹ گیا

''بھئی مجھ سے نہ آیا جائے گا تم خود ہی چلے آؤ۔۔۔۔۔واللہ بڑی دلفریب جگہ ہے تمہاری سب کوفت دور ہو جائے گی''

باغ کا مالک موٹر سے نکلا۔۔۔۔۔اور غصے میں بھرا ہوا نعیم کے پاس آیا

''اٹھو یہاں سے''

نعیم کے کانوں کو اس کی تیکھی آواز بہت ناگوار گزری'' اتنے اونچے نہ بولو۔۔۔آؤ میرے پاس لیٹ جاؤ۔۔۔بالکل خاموش جس طرح کہ میں لیٹا ہوا ہوں۔۔۔آنکھیں بند کر لو۔۔۔اپنا سارا جسم ڈھیلا چھوڑ دو۔۔۔دماغ کی ساری بتیاں گل کر دو۔۔۔پھر جب تم اس اندھیرے میں چلو گے تو ٹٹولتی ہوئی تمہاری انگلیاں غیر ارادی طور پر ایسے قمقمے روشن کریں گی جن کے وجود سے تم بالکل غافل تھے۔''

آؤ میرے ساتھ لیٹ جاؤ

باغ کے مالک نے ایک لحظہ سوچا۔۔۔نعیم سے کہا

''دیوانے معلوم ہوتے ہو۔۔۔''

نعیم مسکرایا ''نہیں۔۔۔تم نے کبھی دیوانے دیکھے ہی نہیں۔۔۔۔میری

جگہ یہاں اگر کوئی دیوانہ ہوتا تو وہ ان بکھری ہوئی جھاڑیوں اور ٹہنیوں پر بچوں کے گالوں کے مانند لٹکے ہوئے پھولوں سے کبھی مطمئن نہ ہوتا۔۔۔۔۔۔ دیوانگی اطمینان کا نام نہیں میرے دوست۔۔۔۔۔ لیکن آؤ ہم دیوانگی کی باتیں کریں۔"

"بکواس بند کرو۔۔۔۔۔ نکل جاؤ یہاں سے"

باغ کے مالک کو طیش آ گیا۔۔۔۔ اس نے اپنے ڈرائیور کو بلایا کہ آ کر نعیم کو دھکے مار کر باہر نکال دے۔

"ارے تم کون ہو۔۔۔۔۔ بڑے بدتمیز معلوم ہوتے ہو"

جب نعیم باہر جا رہا تھا تو اس نے گیٹ پر ایک بورڈ دیکھا جس پر یہ لکھا تھا" بغیر اجازت اندر آنا منع ہے"

وہ مسکرایا

"حیرت ہے کہ یہ میری نظروں سے اوجھل رہا۔۔۔۔۔ نظر ہو تو بعض چیزیں نظر نہیں بھی آتیں۔۔۔۔۔ آہ نظر کی یہ بے نظیری"

یہاں سے نکل کر وہ ایک آرٹ کی نمائش میں چلا گیا تا کہ اپنی ذہنی تکدر دور کر سکے

ہال میں داخل ہوتے ہی اس کو عورتوں اور مردوں کا جھرمٹ نظر آیا جو دیواروں پر لگی پینٹنگز دیکھ رہا تھا۔

ایک مرد کسی پارسی عورت سے کہہ رہا تھا

"مسز فوجدار۔۔۔۔ یہ پینٹنگ دیکھی آپ نے"

مسز فوجدار نے تصویر کو ایک نظر دیکھنے کے بعد ایک عورت شیریں کی طرف

بڑے غور سے دیکھا اور اس مرد سے جو غالباً اس کا ہونے والا شوہر تھا کہا

''تم نے دیکھا شیریں کتنی سج بن کے آئی ہے۔''

ایک نوجوان عورت ایک نوعمر لڑکی سے کہہ رہی تھی ''ثریا ادھر آ کے تصویریں دیکھ۔۔۔۔۔تو وہاں کھڑی کیا کر رہی ہے''

ثریا کو تصویروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اصل میں اس کو ایک بوائے فرینڈ سے ملنا تھا۔

ایک ادھیڑ عمر کا مرد جسے پینٹنگز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اپنے ادھیڑ عمر کے دوست سے کہہ رہا تھا۔

''للی زکام کی وجہ سے نڈھال ہے، ورنہ ضرور آتی۔۔۔۔۔۔آپ جانتے ہی ہیں پینٹنگز سے اسے کتنی دلچسپی ہے اب تو وہ بہت اچھی تصویریں بنا لیتی ہے پرسوں اس نے پنسل کاغذ لے کر اپنے چھوٹے بھائی کی سائیکل کی تصویر اتاری۔۔۔۔۔میں تو دنگ رہ گیا''

نعیم پاس کھڑا تھا۔۔۔۔۔اس نے ہلکے سے طنز کے ساتھ کہا

''ہو بہو سائیکل معلوم ہوتی ہو گی''

دونوں دوست بھونچکے ہو کر رہ گئے کہ یہ کون بدتمیز ہے چنانچہ ان میں سے ایک نے نعیم سے پوچھا۔

''آپ کون ہیں؟''

نعیم بوکھلا گیا

''میں۔۔۔۔۔میں''

”میں میں کیا کرتے ہو۔۔۔ بتاؤ تم کون ہو“

نعیم نے سنبھل کر کہا

”آپ ذرا آرام سے پوچھئے۔۔۔۔۔۔ میں آپ کو بتا سکتا ہوں“

”تم یہاں آئے کیسے؟“

نعیم کا جواب بڑا مختصر تھا

”جی پیدل۔۔۔“

عورتیں اور مرد جو آس پاس کھڑے تصویریں دیکھنے کی بجائے خدا معلوم کن کن چیزوں پر تبصرہ کر رہے تھے ہنسنا شروع کر دیا۔۔۔ اتنے میں اس نمائش کا ناظم آیا اس کو جب نعیم کی گستاخی کے متعلق بتایا گیا تو اس نے بڑے کڑے انداز میں اس سے پوچھا

”تمہارے پاس کارڈ ہے“

نعیم نے بڑے بھولے پن سے جواب دیا

”کارڈ۔۔۔۔۔ کیسا کارڈ۔۔۔ پوسٹ کارڈ؟“

ناظم نے اپنا لہجہ اور کڑا کر کے نعیم سے کہا

”بغیر اجازت تم اندر چلے آئے جاؤ بھاگ جاؤ یہاں سے“

نعیم ایک تصویر کو دیکھ کر دیر تک دیکھنا چاہتا تھا مگر اسے بادل نخواستہ وہاں سے نکلنا پڑا۔۔۔ سیدھا اپنے گھر گیا دروازے پر دستک دی اس کا نوکر فضول باہر نکلا نعیم نے اس سے درخواست کی۔

”کیا میں اندر آ سکتا ہوں“

فضلو بوکھلا گیا۔۔۔ ''حضور۔۔۔ حضور۔۔ یہ آپ کا اپنا گھر ہے اجازت کیسی؟''

نعیم نے اس سے کہا

''نہیں فضلو۔۔۔۔ یہ میرا گھر نہیں۔۔۔۔ یہ گھر جو مجھے راحت بخشتا ہے کیسے میرا ہو سکتا ہے۔۔۔ مجھے اب ایک نئی بات معلوم ہوئی ہے''

فضلو نے بڑے ادب سے پوچھا

''کیا سرکار؟''

نعیم نے کہا

''یہی کہ یہ میرا گھر میرا نہیں۔۔۔ البتہ اس کا گرد و غبار۔۔۔ اس کی تمام غلاظتیں میری ہیں۔۔۔۔۔ وہ تمام چیزیں جن سے مجھے کوفت ہوتی ہے میری ہیں لیکن وہ تمام چیزیں جن سے مجھے راحت پہنچتی ہے کسی اور کی۔۔۔۔ خدا جانے کس کی۔۔۔۔ میں اب ڈرتا ہوں۔۔۔ کسی اچھی چیز کو اپنانے سے خوف لگتا ہے یہ پانی میرا نہیں۔۔۔ یہ ہوا میری نہیں۔۔۔۔ یہ آسمان میرا نہیں۔۔۔۔۔ وہ لحاف جو میں سردیوں میں اوڑھتا ہوں میرا نہیں۔۔۔ اس لیے کہ میں اس سے راحت طلب کرتا تھا۔''

فضلو جاؤ۔۔۔۔ تم بھی میرے نہیں

نعیم نے فضلو کو کوئی بات کرنے نہ دی

وہ چلا گیا

رات کے دس بج چکے تھے

ہیرا منڈی کے ایک کوٹھے سے پیا بن ناہیں آوت چین کے بول باہر اڑ اڑ کے آ رہے تھے

نعیم اس کوٹھے پر چلا گیا

اندر مجرا سننے والے تین چار مردوں کی طرف دیکھا۔۔۔اور طوائف سے کہا

"ان اصحاب کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا"

طوائف مسکرائی

"نہیں کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔۔۔۔۔ادھر مسند پر بیٹھے۔۔۔گاؤ تکیہ لے لیجیے"

نعیم بیٹھ گیا۔۔۔اس نے کمرے کا جائزہ لیا اور اس طوائف سے کہا

"یہ کتنی اچھی جگہ ہے"

طوائف سنجیدہ ہوگئی

"آپ کیا مذاق اڑانے آئے ہیں۔۔۔۔یہ اچھی جگہ ہے۔۔۔۔۔۔جسے تم شرفا حد سے زیادہ گندی جگہ کہتے ہیں"

نعیم نے اس سے کہا

"یہ اچھی جگہ اس لیے ہے کہ یہاں بغیر اجازت کے آنا منع ہے کا بورڈ آویزاں نہیں ہے۔"

یہ سن کو طوائف اور اس کا مجرا سننے والے تماشبین ہنسنے لگے

نعیم نے ایسا محسوس کیا کہ دنیا ایک اس قسم کی طوائف ہے جسے مجرا سننے کے لیے اس قسم کے چغد آتے ہیں۔

بلاؤز

کچھ دنوں سے مومن بہت بے قرار تھا۔ اس کا وجود کچا پھوڑا سا بن گیا تھا۔ کام کرتے وقت باتیں کرتے ہوئے حتیٰ کہ سوچنے پر بھی اسے ایک عجیب قسم کا درد محسوس ہوتا تھا۔ ایسا درد جس کو اگر وہ بیان بھی کرنا چاہتا تو نہ کرسکتا۔

بعض اوقات بیٹھے بیٹھے وہ ایک دم چونک پڑتا۔ دھندلے دھندلے خیالات جو عام حالتوں میں بے آواز بلبلوں کی طرح پیدا ہو کر مٹ جایا کرتے ہیں۔ مومن کے دماغ میں بڑے شور کے ساتھ پیدا ہوتے اور شور ہی کے ساتھ پھٹتے۔ اس کے دل و دماغ کے نرم و نازک پردوں پر ہر وقت جیسے خاردار پاؤں والی چیونٹیاں سی رینگتی تھیں ایک عجیب قسم کا کھنچاؤ اس کے اعضاء میں پیدا ہو گیا تھا جس کے باعث اسے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ اس تکلیف کی شدت جب بڑھ جاتی تو اس کے جی میں آتا کہ اپنے آپ کو ایک بڑے سے هاون میں ڈال دے اور کسی سے کہے۔

''مجھے کوٹنا شروع کردیں۔''

باورچی خانہ میں گرم مصالحہ کو کوٹتے وقت جب لوہے سے لوہا ٹکراتا اور دھمکیوں سے چھت میں ایک گونج سی دوڑ جاتی تو مومن کے ننگے پیروں کو یہ لرزش بہت بھلی معلوم ہوتی۔ پیروں کے ذریعے سے یہ لرزش اس کی تنی ہوئی پنڈلیوں اور رانوں میں دوڑتی ہوئی اس کے دل تک پہنچ جاتی، جو تیز ہوا میں رکھے ہوئے دیئے کی لو کی طرح کانپنا شروع کردیتا۔

مومن کی عمر پندرہ برس کی تھی۔ شاید سولھواں بھی لگا ہو۔ اسے اپنی عمر کے متعلق

صحیح اندازہ نہیں تھا۔ وہ ایک صحت مند اور تندرست لڑکا تھا۔ جس کا لڑکپن تیزی سے جوانی کے میدان کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اسی دوڑ نے جس سے مومن بالکل غافل تھا اس کے لہو کے ہر قطرے میں سنسنی پیدا کر دی۔ وہ اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا مگر ناکام رہتا۔

اس کے جسم میں کئی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ گردن جو پہلے پتلی تھی۔ اب موٹی ہو گئی تھی۔ بانہوں کے پٹھوں میں اینٹھن سی پیدا ہو گئی تھی۔ کنٹھ نکل رہا تھا۔ سینے پر گوشت کی تہہ موٹی ہو گئی تھی اور اب کچھ دنوں سے پستانوں میں گولیاں سے پڑ گئی تھیں۔ جگہ ابھر آئی تھی جیسے کسی نے ایک ایک بنٹا اندر داخل کر دیا ہے۔ ان ابھاروں کو ہاتھ لگانے سے مومن کو بہت درد محسوس ہوتا تھا۔ کبھی کبھی کام کرنے کے دوران میں غیر ارادی طور پر جب اس کا ہاتھ ان گولیوں سے چھو جاتا تو وہ تڑپ اٹھتا۔ قمیض کے موٹے اور کھردرے کپڑے سے بھی اس کو تکلیف دہ سرسراہٹ محسوس ہوتی تھی۔

غسل خانے میں نہاتے وقت یا باورچی خانہ میں جب کوئی اور موجود نہ ہو۔ مومن اپنے قمیض کے بٹن کھول کر ان گولیوں کو غور سے دیکھتا۔ ہاتھوں سے مسلتا۔ درد ہوتا۔ ٹیسیں اٹھتیں۔ جیسے جسم پھلوں سے لدے ہوئے پیڑ کی طرح زور سے ہلایا گیا ہو۔ کانپ کانپ جاتا۔ مگر اس کے باوجود وہ اس درد پیدا کرنے والے کھیل میں مشغول رہتا۔ کبھی کبھی زیادہ دبانے پر یہ گولیاں پچک جاتیں اور ان کے منہ سے ایک لیسدار لعاب نکل آتا۔ اس کو دیکھ کر اس کا چہرہ کان کی لوؤں تک سرخ ہو جاتا۔ وہ یہ سمجھتا کہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے۔

گناہ اور ثواب کے متعلق مومن کا علم بہت محدود تھا۔ ہر وہ فعل جو ایک انسان دوسرے انسان کے سامنے نہ کرسکتا ہو۔اس کے خیال کے مطابق گناہ تھا۔ چنانچہ جب شرم کے مارے اس کا چہرہ کان کی لوؤں تک سرخ ہو جاتا تو وہ جھٹ سے اپنی قمیض کے بٹن بند کرلیتا اور دل میں عہد کرتا کہ آئندہ ایسی فضول حرکت کبھی نہیں کرے گا لیکن اس عہد کے باوجود دوسرے یا تیسرے روز تخلیے میں وہ پھر اس کھیل میں مشغول ہو جاتا۔

مومن سے سب گھر والے خوش تھے۔ بڑا محنتی لڑکا تھا۔ جب ہر کام وقت پر کر دیتا تو کسی کو شکایت کا موقع کیسے ملتا۔ ڈپٹی صاحب کے یہاں اسے کام کرتے ہوئے صرف تین مہینے ہوئے تھے۔ لیکن اس قلیل عرصے میں اس نے گھر کے ہر فرد کو اپنی محنت کش طبیعت سے متاثر کرلیا تھا۔ چھ روپے مہینے پر نوکر ہوا تھا۔ مگر دوسرے مہینے ہی اس کی تنخواہ میں دو روپے بڑھا دیئے گئے تھے۔ وہ اس گھر میں بہت خوش تھا۔ اس لیے کہ اس کی یہاں قدر کی جاتی تھی مگر اب کچھ دنوں سے وہ بے قرار تھا۔ ایک عجیب قسم کی آوارگی اس کے دماغ میں پیدا ہوگئی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ سارا دن بے مطلب بازاروں میں گھومتا پھرے یا کسی سنسان مقام پر جا کر لیٹا رہے۔

اب کام میں اس کا جی نہیں لگتا تھا لیکن اس بے دلی کے ہوتے ہوئے بھی وہ کاہلی نہیں برتتا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ گھر میں کوئی بھی اس کے اندرونی انتشار سے واقف نہیں تھا۔ رضیہ تھی سو وہ دن بھر باجہ بجانے، نئی نئی فلمی طرزیں سیکھنے اور رسالے پڑھنے میں مصروف رہتی تھی۔ اس نے کبھی مومن کی نگرانی ہی نہ کی تھی۔

شکیلہ البتہ مومن سے ادھر ادھر کے کام لیتی تھی اور کبھی کبھی اسے ڈانٹتی بھی تھی۔ مگر اب کچھ دنوں سے وہ بھی چند بلاؤزوں کے نمونے اتارنے میں بے طرح مشغول تھی۔ یہ بلاؤز اس کی ایک سہیلی کے تھے جسے نئی نئی تراشوں کے کپڑے پہننے کا بے حد شوق تھا۔ شکیلہ اس سے آٹھ بلاؤز مانگ کر لائی تھی اور کاغذوں پر ان کے نمونے اتار رہی تھی چنانچہ اس نے بھی کچھ دنوں سے مومن کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔

ڈپٹی صاحب کی بیوی سخت گیر عورت نہیں تھی۔ گھر میں دو نوکر تھے۔ یعنی مومن کے علاوہ ایک بڑھیا بھی تھی جو زیادہ تر باورچی خانے کا کام کرتی تھی۔ مومن کبھی کبھی اس کا ہاتھ بٹا دیا کرتا تھا۔ ڈپٹی صاحب کی بیوی نے ممکن ہے مومن کی مستعدی میں کوئی کمی دیکھی ہو مگر اس نے مومن سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا اور وہ انقلاب جس میں مومن کا دل و دماغ اور جسم گزر رہا تھا۔ اس سے تو ڈپٹی صاحب کی بیوی بالکل غافل تھی۔ چونکہ اس کا کوئی لڑکا نہیں تھا۔ اس لیے وہ مومن کی ذہنی اور جسمانی تبدیلیوں کو نہیں سمجھ سکتی اور پھر مومن نوکر تھا......... نوکروں کے متعلق کون غور و فکر کرتا ہے؟ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک وہ تمام منزلیں پیدل طے کر جاتے ہیں اور آس پاس کے آدمیوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔

مومن کا بھی بالکل یہی حال تھا۔ وہ کچھ دنوں سے موڑ مڑتا زندگی کے ایک ایسے راستے پر آ نکلا تھا جو زیادہ لمبا تو نہیں تھا مگر بے حد پر خطر تھا۔ اس راستے پر اس کے قدم کبھی تیز تیز اٹھتے تھے۔ کبھی ہولے ہولے وہ دراصل جانتا نہیں تھا کہ ایسے راستوں پر کس طرح چلنا چاہیے۔ انہیں جلدی طے کرنا چاہیے یا کچھ وقت لے کر

آہستہ آہستہ ادھر ادھر کی چیزوں کا سہارا لے کر طے کرنا چاہیے۔ مومن کے ننگے پاؤں کے نیچے آنے والے شباب کی گول گول چکنی بٹیاں پھسل رہی تھیں۔ وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔ اسی لیے بے حد مضطرب تھا۔ اس اضطراب کے باعث کئی بار کام کرتے کرتے چونک کر وہ غیر ارادی طور پر کسی کھونٹی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیتا اور اس کے ساتھ لٹک جاتا۔ پھر اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ ٹانگوں سے پکڑ کر اسے کوئی اتنا کھینچے، اتنا کھینچے کہ وہ ایک مہین تار بن جائے۔ یہ سب باتیں اس کے دماغ کے کسی ایسے گوشے میں پیدا ہوئی تھیں کہ وہ ٹھیک طور پر ان کا مطلب نہیں سمجھ سکتا تھا۔

غیر شعور طور پر وہ چاہتا تھا کہ کچھ ہو.............. کیا ہو؟.............. بس کچھ ہو۔ میز پر قرینے سے چنی ہوئی پلیٹیں ایک دم اچھلنا شروع کر دیں۔ کیتلی پر رکھا ہوا ڈھکنا پانی کے ایک ہی ابال سے اوپر کو اڑ جائے۔ نل کی جستی نالی پر دباؤ ڈالے تو وہ دہری ہو جائے اور اس میں سے پانی کا ایک فوارہ پھوٹ نکلے۔ اسے ایک ایسی زبردست انگڑائی آئے کہ اس کے سارے جوڑ علیحدہ علیحدہ ہو جائیں اور اس میں ایک ڈھیلا پن پیدا ہو جائے۔

کوئی ایسی بات وقوع پذیر ہو جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی ہو۔

مومن بہت بے قرار تھا۔

رضیہ نئی طرز سیکھنے میں مشغول تھی اور شکیلہ کاغذوں پر بلاؤزوں کے نمونے اتار رہی تھی۔ جب اس نے یہ کام ختم کر لیا تو وہ نمونہ جو ان سب میں اچھا تھا۔ سامنے رکھ کر اپنے لیے اودی ساٹن کا بلاؤز بنانا شروع کر دیا۔ اب رضیہ کو بھی اپنا باجا اور

فلمی گانوں کی کاپی چھوڑ کر اس طرف متوجہ ہونا پڑا۔

شکیلہ ہر کام بڑے اہتمام اور چاؤ سے کرتی تھی۔ جب سینے پرونے بیٹھتی تو اس کی نشست بڑی پر اطمینان ہوتی تھی۔ اپنی چھوٹی بہن رضیہ کی طرح وہ افراتفری پسند نہیں کرتی تھی۔ ایک ایک ٹانکا سوچ سمجھ کر بڑے اطمینان سے لگاتی تھی تاکہ غلطی کا امکان نہ رہے۔ پیمائش بھی اس کی بہت صحیح تھی۔ اس لیے کہ پہلے کاغذ کاٹ کر پھر کپڑا کاٹتی تھی۔ یوں وقت زیادہ صرف ہوتا ہے مگر چیز بالکل فٹ تیار ہوتی تھی۔

شکیلہ بھرے بھرے جسم کی صحت مند لڑکی تھی ہاتھ بہت گدگدے تھے۔ گوشت بھری مخروطی انگلیوں کے آخر میں ہر جوڑ پر ایک ایک ننھا گڑھا تھا۔ جب مشین چلاتی تھی تو یہ ننھے ننھے گڑھے ہاتھ کی حرکت سے کبھی کبھی غائب بھی ہو جاتے تھے۔

شکیلہ مشین بھی بڑے اطمینان سے چلاتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی دو یا تین انگلیاں بڑی نرمی کے ساتھ مشین کی ہتھی گھماتی تھیں۔ کلائی میں ایک ہلکا سا خم پیدا ہو جاتا تھا۔ گردن ذرا اس طرف جھک جاتی تھی اور بالوں کی ایک لٹ جسے شاید اپنے لیے کوئی مستقل جگہ نہیں ملتی تھی۔ نیچے پھسل آتی تھی۔ شکیلہ اپنے کام میں اس قدر منہمک رہتی کہ اسے ہٹانے یا جمانے کی کوشش ہی نہیں کرتی تھی۔

جب شکیلہ اودی ساٹن سامنے پھیلا کر اپنے ماپ کا بلاؤز تراشنے لگی تو اسے ٹیپ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کیونکہ ان کا اپنا ٹیپ گھس گھسا کر اب بالکل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ لوہے کا گز موجود تھا مگر اس سے کمر اور سینے کی پیمائش کیسے ہو سکتی ہے۔ اس کے اپنے کئی بلاؤز موجود تھے مگر اب چونکہ وہ پہلے سے کچھ موٹی ہو

گئی تھی۔ اس لیے ساری پیائش دوبارہ کرنا چاہتی تھی۔

قمیض اتار کر اس نے مومن کو آواز دی۔ جب وہ آیا تو اس سے کہا ''جاؤ مومن دوڑ کر چھ نمبر سے کپڑے کا گز لے آؤ۔ کہنا شکیلہ بی بی مانگتی ہے۔''

مومن کی نگاہیں شکیلہ کی سفید بنیان کے ساتھ ٹکرائیں۔ وہ کئی بار شکیلہ بی بی کو ایسی بنیانوں میں دیکھ چکا تھا۔ مگر آج اسے ایک عجیب قسم کی جھجک محسوس ہوئی۔ اس نے اپنی نگاہوں کا رخ دوسری طرف پھیر لیا اور گھبراہٹ میں کہا ''کیسا گز بی بی جی۔''

شکیلہ نے جواب دیا۔ ''کپڑے کا گز......... ایک گز تو یہ تمہارے سامنے پڑا ہے۔ یہ لوہے کا ہے۔ ایک دوسرا گز بھی ہوتا ہے، کپڑے کا۔ جاؤ چھ نمبر میں جاؤ اور دوڑ کے ان سے یہ گز لے آؤ۔ کہنا شکیلہ بی بی مانگتی ہیں۔''

چھ نمبر کا فلیٹ بالکل قریب تھا۔ مومن فوراً ہی کپڑے کا گز لے کر آ گیا۔ شکیلہ نے یہ گز اس کے ہاتھ سے لیا اور کہا۔ ''یہیں ٹھہر جاؤ۔ اسے ابھی واپس لے جانا۔'' پھر وہ اپنی بہن رضیہ سے مخاطب ہوئی۔ ''ان لوگوں کی کوئی چیز اپنے پاس رکھ لی جائے تو وہ بڑھیا تقاضے کر کر کے پریشان کر دیتی ہے......... ادھر آؤ یہ گز لو اور یہاں سے میرا ماپ لو۔''

رضیہ نے شکیلہ کی کمر اور سینے کا ماپ لینا شروع کیا تو ان کے درمیان کئی باتیں ہوئیں۔ مومن دروازے کی دہلیز میں کھڑا تکلیف دہ خاموشی سے یہ باتیں سنتا رہا۔

''رضیہ تم گز کو کھینچ کر ماپ کیوں نہیں لیتیں......... پچھلی دفعہ بھی یہی ہوا۔ تم نے ماپ لیا اور میرے بلاؤز کا ستیاناس ہو گیا۔ اوپر کے حصہ پر اگر کپڑا فٹ نہ

آ ئے تو ادھر ادھر بغلوں میں جھول پڑ جاتے ہیں۔''

''کہاں کا لوں۔ کہاں کا نہ لوں۔ تم تو عجیب مخمصے میں ڈال دیتی ہو۔ یہاں کا ماپ لینا شروع کیا تھا تو تم نے کہا ذرا اور نیچے کا لو......... ذرا چھوٹا بڑا ہو گیا تو کون سی آفت آ جائے گی۔''

''بھئی واہ........ چیز کے فٹ ہونے ہی میں تو ساری خوبصورتی ہے۔ ثریا کو دیکھو کیسے فٹ کپڑے پہنتی ہے۔ مجال ہے جو کہیں شکن پڑے کتنے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں ایسے کپڑے......... لو اب ماپ لو.........''

یہ کہہ کر شکیلہ نے سانس کے ذریعے اپنا سینہ پھلانا شروع کیا۔ جب اچھی طرح پھول گیا تو سانس روک کر اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ ''لو اب جلدی کرو۔''

جب شکیلہ نے سینے کی ہوا خارج کی تو مومن کو ایسا محسوس ہوا۔ اس کے اندر ربڑ کے کئی غبارے پھٹ گئے ہیں۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ ''گز لا دیئے بی بی جی......... دے آؤں۔''

شکیلہ نے اسے جھڑک دیا۔ ''ذرا ٹھہر جاؤ۔''

یہ کہتے ہوئے کپڑے کا گز اس کے ننگے بازو سے لپٹ گیا۔ جب شکیلہ نے اسے اتارنے کی کوشش کی تو مومن کو اس کی سفید بغل میں کالے کالے بالوں کا ایک گچھا نظر آیا۔ مومن کی اپنی بغلوں میں بھی ایسے ہی بال اگ رہے تھے مگر یہ گچھا اسے بہت بھلا معلوم ہوا۔ ایک سنسنی سی اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ ایک عجیب و غریب خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ یہ کالے کالے بال اس

کی مونچھیں بن جائیں۔ بچپن میں وہ بھٹوں کے کالے اور سنہری بال نکال کر اپنی مونچھیں بنایا کرتا تھا۔ ان کو اپنے بالائی ہونٹ پر جماتے وقت جو سرسراہٹ اسے محسوس ہوا کرتی تھی۔ اسی قسم کی سرسراہٹ اس خواہش نے اس کے بالائی ہونٹ اور ناک میں پیدا کر دی۔

شکیلہ کا بازو اب نیچے جھک گیا تھا اور بغل چھپ گئی تھی مگر مومن اب بھی کالے بالوں کا وہ گچھا دیکھ رہا تھا۔ اس کے تصور میں شکیلہ کا بازو دیر تک ویسے ہی اٹھا رہا اور بغل میں اس کے سیاہ بال جھانکتے رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد شکیلہ نے مومن کو گز دے دیا اور کہا۔ ''جاؤ.........واپس دے آؤ۔ کہنا بہت بہت شکریہ ادا کیا ہے۔''

مومن گز واپس دے کر باہر صحن میں بیٹھ گیا۔ اس کے دل و دماغ میں دھندلے دھندلے خیال پیدا ہو رہے تھے۔ دیر تک وہ ان کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے غیر ارادی طور پر اپنا چھوٹا سا ٹرنک کھولا جس میں اس نے عید کے لیے نئے کپڑے بنوا کر رکھے تھے۔

جب ٹرنک کا ڈھکنا کھلا اور نئے لٹھے کی بو اس کی ناک تک پہنچی تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ نہا دھو کر اور یہ نئے کپڑے پہن کر وہ سیدھا شکیلہ بی بی کے پاس جائے اور اسے سلام کرے.........اس کی لٹھے کی شلوار کس طرح کھڑ کھڑ کرے گی اور اس کی رومی ٹوپی.........

رومی ٹوپی کا خیال آتے ہی مومن کی نگاہوں کے سامنے اس کا پھندنا آ گیا اور پھندنا فوراً ہی ان کالے کالے بالوں کے گچھے میں تبدیل ہو گیا جو اس نے شکیلہ کی

بغل میں دیکھا تھا۔ اس نے کپڑوں کے نیچے سے اپنی نئی رومی ٹوپی نکالی اور اس کے نرم وار لچکیلے پھندنے پر ہاتھ پھیرنا شروع ہی کیا تھا کہ اندر سے شکیلہ بی بی کی آواز آئی۔ ''مومن!''

مومن کی زبان میں لکنت پیدا ہو گئی۔ ''جی بی بی جی!''

''تو کیا کر رہے تھے؟''

''کچھ............ کچھ بھی نہیں؟''

''کچھ تو ضرور کرتے ہو گے۔'' شکیلہ یہ سوال کیے جا رہی تھی مگر اس کا دھیان اصل میں بلاؤز کی طرف تھا جسے اب اسے کچا کرنا تھا۔

مومن نے کھسیانی ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔ ''ٹرنک کھول کر اپنے نئے کپڑے دیکھ رہا تھا۔''

شکیلہ کھلکھلا کر ہنسی۔ رضیہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

شکیلہ کو ہنستے دیکھ کر مومن کو ایک عجیب سی تسکین محسوس ہوئی اور اس تسکین نے اس کے دل میں یہ خواہش پیدا کی کہ وہ کوئی ایسی مضحکہ خیز طور پر احمقانہ حرکت کرے جس سے شکیلہ کو اور زیادہ ہنسنے کا موقع ملے۔ چنانچہ لڑکیوں کی طرح جھینپ کر اور لہجے میں شرماہٹ پیدا کر کے اس نے کہا۔ ''بڑی بی بی جی سے پیسے لے کر میں ریشمی رومال بھی لاؤں گا۔''

شکیلہ نے ہنستے ہوئے اس سے پوچھا۔ ''کیا کرو گے اس رومال کو؟''

مومن نے جھینپ کر جواب دیا۔ ''گلے میں باندھ لوں گا بی بی جی............ بڑا اچھا معلوم ہو گا۔''

یہ سن کر شکیلہ اور رضیہ دونوں دیر تک ہنستی رہیں۔

"گلے میں باندھو گے تو یاد رکھنا اسی سے پھانسی دے دوں گی۔" یہ کہہ کر شکیلہ نے اپنی ہنسی دبانے کی کوشش کی اور رضیہ نے کہا "کمبخت نے مجھے کام ہی بھلا دیا رضیہ میں نے اسے کیوں بلایا تھا؟"

رضیہ نے جواب نہ دیا اور وہ نئی فلمی طرز گنگنانا شروع کر دی جو وہ دو روز سے سیکھ رہی تھی۔ اس دوران میں شکیلہ کو خود ہی یاد آ گیا کہ اس نے مومن کو کیوں بلایا تھا۔ "دیکھو مومن! میں تمہیں یہ بنیان اتار کر دیتی ہوں۔ دوائیوں کے پاس جو ایک دکان نئی کھلی ہے نا، وہی جہاں تم اس دن میرے ساتھ گئے تھے۔ وہاں جاؤ اور پوچھ کے آؤ کہ ایسی چھ بنیانوں کا وہ کیا لے گا.......... کہنا ہم چھ لیں گے۔ اس لیے کچھ رعایت ضرور کرے.......... سمجھ لیا نا؟"

مومن نے جواب دیا۔ "جی ہاں!"

"اب تم پرے ہٹ جاؤ۔"

مومن باہر نکل کر دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ چند لمحات کے بعد بنیان اس کے قدموں کے پاس آ گرا اور اندر سے شکیلہ کی آواز آئی۔ "ہم اسی قسم کی اسی ڈیزائن کی بالکل یہی چیز لیں گے۔ فرق نہیں ہونا چاہیے۔"

مومن نے بہت اچھا کہہ کر بنیان اٹھا لیا جو پسینے کے باعث کچھ کچھ گیلا ہو رہا تھا۔ جیسے کسی نے بھاپ پر رکھ کر فوراً ہی ہٹا لیا ہو۔ بدن کی بو بھی اس میں بسی ہوئی تھی میٹھی میٹھی گرمی بھی تھی۔ یہ تمام چیزیں اس کو بہت بھلی معلوم ہوئیں۔

وہ اس بنیان کو جو بلی کے بچے کی طرح ملائم تھا۔ اپنے ہاتھوں میں مسلتا باہر چلا

گیا۔ جب بھاؤ واؤ دریافت کر کے بازار سے واپس آیا تو شکیلہ بلاؤز کی سلائی شروع کر چکی تھی اس اودی اودھی ساٹن کے بلاؤز کی جو مومن کی رومی ٹوپی کے پھندنے سے کہیں زیادہ چمکیلی اور لچکدار تھی۔

یہ بلاؤز شاید عید کے لیے تیار کیا جا رہا تھا کیونکہ عید اب بالکل قریب آ گئی تھی۔

مومن کو ایک دن میں کئی بار بلایا گیا۔ دھاگہ لانے کے لیے، استری نکالنے کے لیے، سوئی ٹوٹ گئی تو نئی سوئی لانے کے لیے شام کے قریب جب شکیلہ نے دوسرے روز پر باقی کام اٹھا دیا تو وہ دھاگے کے ٹکڑے اور اودی ساٹن کی بیکار کترین اٹھانے کے لیے بھی اسے بلایا گیا۔

مومن نے اچھی طرح جگہ صاف کر دی۔ باقی سب چیزیں اٹھا کر باہر پھینک دیں۔ مگر ساٹن کی چمکیلی کترین اپنی جیب میں رکھ لیں............ بالکل بے مطلب کیونکہ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ ان کا کیا کرے گا؟

دوسرے روز اس نے جیب سے کترین نکالیں اور الگ بیٹھ کر ان کے دھاگے الگ کرنے شروع کر دیئے۔ دیر تک وہ اس کھیل میں مشغول رہا۔ حتیٰ کہ دھاگے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا ایک گچھا سا بن گیا۔ اس کو ہاتھ میں لے کر وہ دباتا رہا۔ مسلتا رہا۔ لیکن اس کے تصور میں شکیلہ کی وہی بغل تھی جس میں اس نے کالے کالے بالوں کا ایک چھوٹا سا گچھا دیکھا تھا۔

اس دن بھی اسے شکیلہ نے کئی بار بلایا............ اودی ساٹن کے بلاؤز کی ہر شکل اس کی نگاہوں کے سامنے آتی رہی۔ پہلے جب اسے کچا کیا گیا تھا تو اس پر

سفید دھاگے کے بڑے بڑے ٹانکے جابجا پھیلے ہوئے تھے۔ پھر اس پر استری کی گئی جس سے سب شکنیں دور ہو گئیں اور چمک بھی دوبالا ہو گئی۔ اس کے بعد کچی حالت ہی میں شکیلہ نے اسے پہنا۔ رضیہ کو دکھایا۔ دوسرے کمرے میں سنگھار میز کے پاس آئینے میں خود کو ہر پہلو سے اچھی طرح دیکھا۔ جب پورا اطمینان ہو گیا تو اسے اتارا۔ جہاں جہاں تنگ یا کھلا تھا وہاں نشان بنائے۔ اس کی ساری خامیاں دور کیں۔ ایک بار پھر پہن کر دیکھا جب بالکل فٹ ہو گیا تو پکی سلائی شروع کی۔

ادھر ساٹن کا یہ بلاؤز سیا جا رہا تھا۔ ادھر مومن کے دماغ میں عجیب و غریب خیالوں کے ٹانکے سے ادھڑ رہے تھے ...... جب اسے کمرے میں بلایا جاتا اور اس کی نگاہیں چمکیلی ساٹن کے بلاؤز پر پڑتیں تو اس کا جی چاہتا کہ وہ ہاتھ سے چھو کر اسے دیکھے صرف چھو کر ہی نہیں ...... بلکہ اس کی ملائم اور روئیں دار سطح پر دیر تک ہاتھ پھیرتا رہے۔ اپنے کھردرے ہاتھ۔

اس نے ان ساٹن کے ٹکڑوں سے ان کی ملائمت کا اندازہ کر لیا تھا۔ دھاگے جو اس نے ٹکڑوں سے نکالے تھے اور بھی زیادہ ملائم ہو گئے تھے۔ جب اس نے ان کا گچھا بنایا تو دباتے وقت اسے معلوم ہوا تھا کہ ان میں ربڑ کی سی لچک بھی ہے ...... وہ جب بھی اندر آ کر بلاؤز کو دیکھتا۔ ان کا خیال فوراً ان بالوں کی طرف دوڑ جاتا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھے تھے۔ کالے کالے بال۔ مومن سوچتا تھا کیا وہ بھی اس ساٹن ہی کی طرح ملائم ہوں گے؟

بلاؤز بالآخر تیار ہو گیا ...... مومن کمرے کے فرش پر گیلا کپڑا پھیر رہا تھا۔ کہ شکیلہ اندر آئی۔ قمیض اتار کر اس نے پلنگ پر رکھی۔ اس کے نیچے اسی قسم کا سفید

بنیان تھا۔ جس کا نمونہ لے کے مومن بھاؤ دریافت کرنے گیا تھا............ اس کے اوپر شکیلہ نے اپنے ہاتھ کا سلا ہوا بلاؤز پہنا۔ سامنے کے ہک لگائے اور آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

مومن نے فرش صاف کرتے ہوئے آئینہ کی طرف دیکھا۔ بلاؤز میں اب جان سی پڑ گئی تھی۔ ایک دو جگہ پر وہ اس قدر چمکتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا ساٹن کا رنگ سفید ہوگیا ہے............ شکیلہ کی پیٹھ مومن کی طرف تھی جس پر ریڑھ کی ہڈی کی لمبی چھری بلاؤز فٹ ہونے کے باعث اپنی پوری گہرائی کے ساتھ نمایاں تھی۔ مومن سے رہا نہ گیا۔ چنانچہ اس سے کہا۔ ''بی بی جی! آپ نے درزیوں کو بھی مات کر دیا ہے۔''

شکیلہ اپنی تعریف سن کر خوش ہوئی مگر وہ رضیہ کی رائے طلب کرنے کے لیے بے قرار تھی۔ اس لیے وہ صرف ''اچھا ہے نا'' کہہ کر باہر دوڑ گئی............ مومن آئینے کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ جس میں بلاؤز کا سیاہ اور چمکیلا عکس دیر تک موجود رہا۔

رات کو جب وہ پھر اس کمرے میں صراحی رکھنے کے لیے آیا تو اس نے کھونٹی پر لکڑی کے ہینگر میں اس بلاؤز کو دیکھا۔ کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ چنانچہ آگے بڑھ کر پہلے اس نے غور سے دیکھا۔ پھر ڈرتے ڈرتے اس پر ہاتھ پھیرا۔ ایسا کرتے ہوئے یوں لگا کہ کوئی اس کے جسم کے ملائم روئیں پر ہولے ہولے بالکل ہوائی لمس کی طرح ہاتھ پھیر رہا ہے۔

رات کو جب وہ سویا تو اس نے کئی اوٹ پٹانگ خواب دیکھے............ ڈپٹی

صاحب نے پتھر کے کوئلوں کا ایک بڑا ڈھیر اسے کوٹنے کو کہا۔ جب اس نے ایک کوئلہ اٹھایا اور اس پر ہتھوڑے کی ضرب لگائی تو وہ نرم نرم بالوں کا ایک گچھا بن گیا .... یہ کالی کھانڈ کے مہین مہین تار تھے۔ جن کا گولا بنا ہوا تھا پھر یہ گولے کالے رنگ کے غبارے بن کر ہوا میں اڑنا شروع ہوئے .... بہت اوپر جا کر یہ پھٹنے لگے .... پھر آندھی آ گئی اور مومن کی رومی ٹوپی کا پھندنا کہیں غائب ہو گیا .... پھندنے کی تلاش میں وہ نکلا .... دیکھی ان دیکھی جگہوں میں گھومتا رہا .... نئے لٹھے کی بو بھی کہیں سے آنا شروع ہوئی پھر نہ جانے کیا ہوا .... ایک کالی ساٹن کے بلاؤز پر اس کا ہاتھ پڑا .... کچھ دیر وہ اس دھڑکتی ہوئی چیز پر اپنا ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر دفعتاً ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھوڑی دیر تک تو وہ کچھ نہ سمجھ سکا کہ کیا ہو گیا ہے اس کے بعد اسے خوف اور تعجب اور ایک انوکھی ٹیس کا احساس ہوا، اس کی حالت اس وقت عجیب و غریب تھی، پہلے اسے تکلیف دہ حرارت محسوس ہوئی تھی، مگر چند لمحات کے بعد ایک ٹھنڈی سی لہر اس کے جسم پر رینگنے لگی۔

بلونت سنگھ مجیٹھیا

شاہ صاحب سے جب میری ملاقات ہوئی تو ہم فوراً بے تکلف ہو گئے۔ مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ سید ہیں اور میرے دور دراز کے رشتے دار بھی ہیں۔ وہ میرے دور یا قریب کے رشتہ دار کیسے ہو سکتے تھے، اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ سید تھے اور میں ایک محض کشمیری۔

بہر حال ان سے میری بے تکلفی بہت بڑھ گئی۔ ان کو ادب سے کوئی شغف نہیں تھا۔ لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ میں افسانہ نگار ہوں تو انہوں نے مجھ سے میری چند کتابیں مستعار لیں اور پڑھیں۔

یہ کتابیں جو کہ افسانوں کے مجموعے تھیں، انہوں نے پڑھیں اور مجھے بہت تعجب ہوا کہ انہوں نے چند افسانوں کی بہت تعریف کی۔ اتفاق سے یہ افسانے ایسے تھے جو ادبی دنیا میں شاہکار تسلیم کیے جا چکے تھے۔

شاہ صاحب میرے پڑوسی تھے۔ انہوں نے ایک مکان الاٹ کرا رکھا تھا۔ لیکن خاندان کے افراد چونکہ زیادہ تھے اس لیے انہوں نے اپنے فلیٹ کے نیچے موٹر گیراج پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ اس میں انہوں نے اپنی بیٹھک کا انتظام کیا تھا۔ اوپر زنانہ تھا، شاہ صاحب کے دوست یار بے شمار تھے اس لیے اس گیراج میں وہ ان کی خاطر مدارات کرتے تھے۔

ایک دن ان سے افسانوں کے بارے میں باتیں ہوئیں تو انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”میری زندگی میں ایسی کئی حقیقتیں ہیں جن کو تم افسانے بنا کر پیش کر سکتے

ہو۔‘‘

میں ہر وقت فسانوں کی تلاش میں رہتا ہوں۔ چنانچہ میں فوراً متوجہ ہوا اور شاہ صاحب سے کہا۔ ’’مجھے امید ہے کہ آپ اچھا مواد دیں گے!‘‘

شاہ صاحب نے جواباً کہا۔ ’’میں افسانہ نگار نہیں .... لیکن میری زندگی میں ایک ایسا واقعہ ہوا ہے جو قابلِ ذکر ہے .... میں نے قابلِ ذکر اس لیے کہا ہے کہ آپ بہت بڑے افسانہ نگار ہیں۔ ورنہ یہ واقعہ جو میں اب بیان کرنے والا ہوں میرے نزدیک بے حد حیرت انگیز ہے۔‘‘

شاہ صاحب نے کہا ’’جی! میں نہیں کہہ سکتا کہ جو واقعہ میں آپ کو سنانے والا ہوں، ہر شخص کے لیے حیرت کا باعث ہوگا .... میں صرف اپنی ذات کے متعلق آپ سے عرض کر رہا ہوں ...... اور یہ حقیقت ہے کہ میں جو داستان آپ کو سناؤں گا، اس وقت تک میری زندگی میں محیر العقول حیثیت رکھتی ہے۔‘‘

شاہ صاحب نے ’’نیل کٹر‘‘ سے اپنے ناخن کاٹنے شروع کیے میں ان کی داستان سننے کے لیے بے تاب تھا، مگر شاید وہ آغاز کے متعلق سوچ رہے تھے کہ اپنی داستان کو کہاں سے شروع کریں۔ میرا خیال درست تھا کہ جو کچھ ان پر بیتا تھا اس کو کئی برس ہو چکے تھے وہ تمام واقعات کی یاد اپنے ذہن میں تازہ کر رہے تھے۔

میں نے سگریٹ سلگایا۔ انہوں نے اپنی دس انگلیوں کے ناخن کاٹ کر ’’نیل کٹر‘‘ تپائی پر رکھا اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ’’میں ان دنوں کابل میں تھا۔‘‘ یہ کہہ کر وہ چند لمحات خاموش رہے، اس کے بعد بولے۔ ’’میری وہاں بہت بڑی دکان تھی جس میں بڑھیا سے بڑھیا سامان موجود رہتا تھا۔‘‘

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا۔ ''آپ جنرل مرچنٹ تھے؟''

شاہ صاحب نے جواب دیا۔ ''جی ہاں .... کابل کا سب سے بڑا جنرل مرچنٹ ...... میری دکان میں کابل کی قریب قریب ہر عورت سودا لینے آتی تھی .... آپ سے میں ایک بات عرض کروں .... ساتھ کے دکاندار جب یہ دیکھتے تھے کہ کسی روز عورتوں کی بجائے میری دکان میں مرد گاہک آئے ہیں تو وہ مجھ سے فارسی زبان میں افسوس کا اظہار کرتے تھے کہ آغا آج یہ کیا ہوا .... کابل کی عورتیں اور لڑکیاں مر گئیں یا تمہارے نصیب سو گئے۔''

شاہ صاحب مسکرا دیتے تھے .... اس کے علاوہ اور وہ کیا جواب دے سکتے تھے لیکن ان کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ ان کی دکان میں گاہکوں کی اکثریت عورتوں اور لڑکیوں کی ہوتی ہے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ سب ان کی چرب زبانی کا معجزہ ہے۔

انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''منٹو صاحب میں بہترین سیلز مین ہوں خاص طور پر عورتوں کے ساتھ تو میں اس طرح سودا کر سکتا ہوں کہ یہاں لاہور میں کوئی بھی نہیں کر سکتا .... بی، اے ہوں .... تھوڑی بہت سائیکالوجی بھی میں نے پڑھی ہے، اس لیے مجھے معلوم ہے کہ عورتوں سے کس طرح ''ڈیل'' کیا جا سکتا ہے .... یہی وجہ تھی کہ سارے کابل میں میری دکان ہی ایسی تھی جس میں ہر وقت کوئی نہ کوئی گاہک موجود ہوتا تھا۔''

میں نے شاہ صاحب کی یہ خود تعریفی سنی اور ان سے کہا۔ ''یقیناً آپ بہترین سیلز مین ہیں کہ آپ کی گفتگو کا انداز ہی اس کا ثبوت ہے۔''

شاہ صاحب مسکرائے۔ ''مگر مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی داستان بہترین سیلز مین کے انداز بیان میں بیان نہیں کر سکوں گا۔''

میں نے ان سے کہا۔ ''آپ شروع تو کیجیے۔''

شاہ صاحب نے چند لمحات اپنے حافظے کو پھر ٹٹولا اور اپنی داستان شروع کی۔

''منٹو صاحب! جیسا کہ میں آپ سے پہلے عرض کر چکا ہوں، میں کابل میں تھا۔ یہ کوئی دس برس پہلے کی بات ہے جب میری صحت بہت اچھی تھی۔ یوں تو میں اب بھی تنومند کہلاتا ہوں، مگر اس زمانے میں میرا جسم آج کے مقابلے میں دگنا تھا۔ ہر روز ورزش کرتا تھا سینکڑوں ڈنٹر پیلتا تھا، مگدر گھماتا تھا۔ سگریٹ پیتا تھا نہ شراب، بس ایک اچھا کھانے کی عادت تھی۔ افغانی نہیں، ہندوستانی، چنانچہ میں امرتسر سے اپنے ساتھ ایک بہت اچھا کشمیری باورچی لے گیا تھا جو ہر روز میرے لیے لذیذ سے لذیذ کھانے تیار کر کے میز پر رکھتا تھا میری زندگی بڑی ہموار گزر رہی تھی۔ آمدن بہت معقول تھی۔ بینک میں لاکھوں افغانی روپے جمع تھے...... لیکن ......''

شاہ صاحب تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ''لیکن کہہ کر آپ چپ ہو گئے...... اس کا یہ مطلب نہیں نکلتا کہ آپ پھر بھی ناخوش تھے۔''

شاہ صاحب نے اعتراف کیا ''جی ہاں! میں ان تمام آسائشوں کے باوجود ناخوش تھا...... اس لیے کہ میں اکیلا تھا...... مجرد تھا...... اگر میری دکان میں عورتیں اور لڑکیاں زیادہ نہ آتیں تو بہت ممکن ہے کہ مجھے اپنے تجرد کا احساس نہ ہوتا......

لیکن معاملہ اس کے برعکس تھا کابل کی ہر صاحب ثروت عورت میری دکان میں آتی تھی...... دکان میں داخل ہوتے ہی یہ عورتیں اور لڑکیاں اپنا برقع اتار کر ایک طرف رکھتیں اور سودا خریدنے میں مصروف ہوجاتیں........ منٹو صاحب! آپ کا شاید یہ خیال ہو کہ وہ بڑا شرعی قسم کا لباس پہنتی ہوں گی، مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یوں تو وہاں کی عورتیں اور لڑکیاں پردہ کرتی ہیں مگر لباس ٹھیٹ یورپین پہنتی ہیں۔ سکرٹ، کٹے ہوئے بال، رنگے ہوئے ناخن، پنڈلیاں ننگی .... جب وہ میری دکان میں آتی تھیں تو اپنے برقعے اتار کر ایک طرف رکھ دیتی تھیں اور مال دیکھنے میں مصروف ہوجاتی تھیں۔''

شاہ صاحب نے بولنا بند کیا تو میں نے ان سے پوچھا ''آپ کو ان میں سے کسی سے محبت تو یقیناً ہوگئی ہوگی۔''

شاہ صاحب بہت سنجیدہ ہوگئے۔ ''جی ہاں! ایک لڑکی سے ہوئی تھی، جو اپنا برقع نہیں اتارتی تھی، حتیٰ کہ نقاب بھی نہیں اٹھاتی تھی۔''

میں نے ان سے پوچھا۔ ''کون تھی وہ؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''ایک بہت بڑے گھرانے سے متعلق تھی۔ اس کا باپ فوج کا اعلیٰ افسر تھا۔ بڑا سخت گیر......... مجھے اس سے صرف اس لیے محبت ہوئی کہ وہ ہاتھوں کے علاوہ اپنے جسم کا کوئی حصہ نہیں دکھاتی تھی۔''

میں نے پوچھا۔ ''اس کی وجہ؟''

شاہ صاحب نے کہا ''مجھے معلوم نہیں اور نہ میں نے اس سے کبھی اس بارے میں استفسار ہی کیا......... لیکن میرے تصور میں وہ انتہا درجے کی حسین تھی۔

گوری چٹی.......... جسم خواہ برقعے میں لپٹا ہو، لیکن اس کے تناسب کے متعلق اندازہ لگانا کوئی اتنا زیادہ مشکل نہیں تھا.......... میں نے چور آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ وہ جوانی کا آدرش مجسمہ ہے........ لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ چند منٹوں کے لیے میری دکان میں آتی تھی۔ چیزیں خریدنے اور ان کی قیمتوں کے بارے میں فیصلہ کرنے میں چند منٹ صرف کرتی تھی اور چلی جاتی تھی۔''

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا۔ ''یہ سلسلہ کب تک جاری رہا......؟''

''قریب قریب چھ مہینے تک........... مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ میں اس سے اپنی محبت کا اظہار کروں۔ میں اس سے بہت مرعوب تھا، اس لیے کہ وہ دوسروں سے مختلف تھی۔ اس میں ایک عجیب قسم کی رعونت تھی...... میں اس کو بے طرح گھورتا تھا، حالانکہ یہ شائستگی نہیں تھی۔ لیکن میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا...... منٹو صاحب! ایک دن میں دکان میں بیٹھا اس کے متعلق سوچ رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ نوکر نے ریسیور اٹھایا اور مجھ سے کہا کہ کوئی خاتون آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں...... میں نے سوچا کہ کوئی گاہک ہوگی اور نئے مال کے متعلق پوچھنا چاہتی ہوگی۔ اٹھ کر میں نے ریسیور ہاتھ میں لیا اور پوچھا، مادام آپ کیا چاہتی ہیں؟ ادھر سے آواز آئی، کیا آپ سید مظفر علی ہیں؟ میں نے جواب دیا، جی ہاں........ ارشاد!........ اب میں نے آواز پہچان لی تھی........ یہ اسی کی تھی...... اس کی جو میری دکان میں برقع نہیں اتارتی تھی....... میں گھبرا گیا...... منٹو صاحب! یہ عاشق ہونا بھی ایک عجیب لعنت ہے۔''

یہ سن کر میں مسکرایا۔ ''آپ ٹھیک فرماتے ہیں شاہ صاحب........ لیکن

افسوس ہے کہ میں اس لعنت میں ابھی تک گرفتار نہیں ہوا۔''

شاہ صاحب کو بہت افسوس ہوا۔''حد ہو گئی ہے...... انسان اپنی جوانی میں کم از کم ایک مرتبہ تو ضرور عشق میں گرفتار ہوتا ہے...... خیر، آپ کو ابھی تک عشق نہیں ہوا تو خدا کرے کہ بہت جلد ہو جائے، کیونکہ یہ مرض بہت دلچسپ ہے۔''

میں نے مسکرا کر شاہ صاحب سے کہا۔''آپ اپنی داستان بیان کیجیے...... مجھے عشق ہو گا تو میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو اس کی پوری روئیداد سنا دوں گا۔''

شاہ صاحب کرسی پر سے اٹھ کر پلنگڑی پر لیٹ گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔

''منٹو صاحب...... میں اس لڑکی کے عشق میں اس بری طرح گرفتار ہوا کہ ورزش بھول گیا...... وہ میری دکان پر اکثر آتی تھی...... میں اس کو گھورتا تھا...... لیکن دیکھیے میرا دماغ کتنا خراب ہو گیا ہے یہ اسی عشق خانہ خراب کا باعث ہے...... میں آپ سے اس کے ٹیلیفون کی بات کر رہا تھا...... جب میں نے ریسیور اٹھایا اور اس کی آواز پہچان لی تو اس نے مجھ سے کہا دیکھو میں جب بھی تمہاری دکان میں آتی ہوں، تم مجھے گھورتے ہو۔ اگر اپنی خیریت چاہتے ہو، تو ٹھیک ہو جاؤ ورنہ تمہارے حق میں بہت برا ہو گا...... منٹو صاحب میں جواب سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع کر دیا...... میں دیر تک گونگے ریسیور کو کان کے ساتھ لگائے کھڑا رہا اور سوچتا رہا کہ اس دھمکی کا مطلب کیا ہے۔''

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا''کیا وہ دھمکی اصلی تھی؟''

''جی ہاں...... چوتھے روز وہ میری دکان میں آئی تو میں نے اس کی نقاب کی

طرف پھر انہی نگاہوں سے دیکھا تو اس نے جھنجھلا کر میرے ملازموں کے سامنے مجھ سے کہا...... تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم مجھے اس طرح دیکھتے ہو...... میں سن ہو گیا ...... لیکن اس نے چند چیزیں خریدیں...... دام دیئے اور اپنی موٹر میں بیٹھ کر چلی گئی۔"

میں شاہ صاحب کی داستان میں کافی دلچسپی لے رہا تھا۔"عجیب لڑکی تھی...... آپ سے اسے نفرت بھی تھی، مگر اس کے باوجود آپ کی دکان میں آتی تھی۔"

شاہ صاحب نے آنکھیں کھولیں۔"منٹو صاحب! یہی وجہ تھی کہ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کی نفرت و حقارت مصنوعی ہے وہ دراصل وہ میری محبت سے متاثر ہو چکی ہے اور محض بناوٹ کے طور پر غصے کا اظہار کرتی ہے......لیکن جب ایک روز اس نے مجھے بہت زور سے لعن طعن کی تو میں سرد ہو گیا...... پر اس کی محبت تھی جو میرے دل سے جاتی ہی نہیں تھی...... میں نے بہت کوشش کی کہ اس کو بھول جاؤں...... میں نے خود کو سمجھایا کہ تم عجیب بے وقوف ہو۔ ایک لڑکی جس کی تم نے شکل نہیں دیکھی...... جو تم سے نفرت کرتی ہے، تم اس سے عشق فرما رہے ہو۔ باز آؤ، تمہارا کاروبار ماشاءاللہ بہت اچھا ہے۔ سارے افغانستان میں تمہاری ساکھ ہے۔ یہ کیا جھک مار رہے ہو...... لیکن منٹو صاحب عشق بہت بری بلا ہے میں اس سے اپنا پیچھا نہ چھڑا سکا......"

میں نے ان سے کہا"آپ خواہ مخواہ داستان طویل بناتے جا رہے ہیں۔ انجام پر پہنچیے"

شاہ صاحب پلنگڑی پر سے اٹھے اور کرسی پر بیٹھ گئے۔"حضرت ایسی

داستانیں اکثر طویل ہوا کرتی ہیں۔ عشق ایک مرض ہے اور جب تک طول نہ پکڑے، مرض نہیں ہوتا۔ محض ایک مذاق ہوتا ہے...... خیر، اب جبکہ آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنی داستان طویل نہ بتاؤں تو مختصر طور پر عرض کرتا ہوں کہ میرا عشق جب بہت شدت اختیار کر گیا تو ایک روز میں بے اختیار رونے لگا۔ میرے شہر امرتسر کا ایک باشندہ سردار بلونت سنگھ تھا جو مجیٹھے کے ایک اچھے خاندان کا فرد تھا۔ وہ کابل میں ایک انجینئرنگ فرم میں ملازم تھا۔ کھانے پینے والا آدمی تھا، اس لیے وہ ہر مہینے مجھ سے پچاس ساٹھ روپے قرض لے جاتا تھا۔ مزید قرض لینے کی غرض ہی سے وہ اس وقت میری دکان میں آیا جب کہ میری آنکھیں نمناک تھیں۔ وہ میرے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے معلوم نہیں مجھ سے کیا پوچھا اور میں نے جانے کیا جواب دیا لیکن جب اس نے مجھ سے یہ کہا۔ ''دوست تم کو کوئی روگ لگ گیا ہے۔'' تو میں چونک پڑا۔ ''نہیں نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں...... سردار بلونت سنگھ مجیٹھیا اپنی گھنی مونچھوں کے اندر مسکرایا...... تم جھوٹ بولتے ہو، صاف صاف بتاؤ، تمہیں یہاں کسی سے عشق ہوا ہے...... میں خاموش رہا تو وہ پھر بولا، دیکھو اگر کوئی مشکل درپیش ہے تو ہم سب ٹھیک کر دیں گے...... جب اس نے اسی قسم کی چند اور باتیں کیں تو میں نے سارا معاملہ اس کو بتا دیا۔''

میں نے پوچھا ''تو اس نے مشکل آسان کرنے کا کیا گر بتایا؟''

شاہ صاحب نے کہا۔ ''اس نے مجھے ایک منتر بتایا''

''منتر؟''

''جی ہاں!''

"آپ سید ہیں...... کیا آپ منتر جنتر پر ایمان لا سکتے ہیں؟"

شاہ صاحب نے کہا۔ "لانا تو نہیں چاہیے تھا کہ یہ ہمارے مذہب میں جائز نہیں...... لیکن اس وقت سردار بلونت سنگھ کا مشورہ ماننا ہی پڑا، اس لیے کہ عشق بری بلا ہے...... اس نے مجھے ایک منتر بتایا اور کہا کہ سات رنگوں کے پھول لو۔ ان میں سے ہر ایک پر یہ منتر پڑھ کر پھونکو اور منگل کے روز اس لڑکی کو کسی نہ کسی طریقے سے سنگھا دو...... یہ منتر مجھے ابھی تک یاد ہے۔"

میں نے ان سے کہا۔ "ذرا سنائیے تو"

شاہ صاحب نے ایک لمحے کے لیے اپنے حافظے کو ٹٹولا اور کہا:۔

کورو دس مکھیا دیوی
پھل کھڑے پھل سے
پھل چکے ناہر سنگھ پیارے
جو کوہی لے پھلوں کی باس
کبھی نہ چھوڑے ہمارا ساتھ
ہمیں چھوڑ کسی اور کو کرے
پیٹ پھول بھسم ہو مرے
دہائی سلیمان پیر پیغمبر کی!

میں نے یہ منتر سنا تو مجھے اپنا لڑکپن یاد آ گیا جب میں نے منتروں کی ایک کتاب خریدی تھی اور اس میں سے ایک منتر ازبر اس غرض سے کیا تھا کہ میں سکول کے تمام امتحانوں میں پاس ہوتا چلا جاؤں...... یہ منتر مجھے اب تک یاد ہے

......اونگ نما کا مشیری اتماوے بھرینگ پراسواہ...... لیکن اس کے پڑھنے کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ میں نویں جماعت میں فیل ہو گیا تھا۔

میں نے اس منتر کا ذکر شاہ صاحب سے نہ کیا اور ان سے پوچھا۔ ''تو آپ نے سات رنگ کے پھولوں پر یہ منتر پڑھا؟''

''جی ہاں...... وہ آئی...... اس نے مجھے ٹیلیفون پر کہہ دیا تھا کہ وہ آئے گی۔ شام کو پانچ بجے کے قریب۔ میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ وہ ٹھیک پانچ بج کر پانچ منٹ پر آئی اور اس نے چیکوسلواکیا کے مال کے متعلق استفسار کیا۔ عرض یہ ہے کہ مال وال کا قصہ بالکل فراڈ تھا...... میں نے اس سے کہا کہ ملازموں نے ابھی تک پیٹیاں نہیں کھولیں، آپ کل تشریف لائیے گا۔ وہ بہت جز بز ہوئی، میں منتر پڑھے پھولوں کی طرف دیکھ رہا تھا...... اتفاق کی بات کہ اس نے بھی ان پھولوں کی طرف دیکھا اور مجھ سے کہا، یہ پھول تمہاری میز پر کہاں سے آ گئے؟...... میں نے جواب دیا، یہ میں نے آپ کے لیے خریدے تھے۔ اگر آپ کو پسند ہوں...... میرا مطلب ہے اگر آپ کو ان کی خوشبو پسند ہو۔ تو آپ انہیں قبول فرمائیں...... اس نے وہ سات پھول اٹھائے اور انہیں سونگھا۔''

میں نے ان سے پوچھا ''اس لڑکی کا ردِ عمل کیا تھا؟''

شاہ صاحب نے جواب دیا۔ ''اس نے ناک بھوں چڑھا کر کہا...... یہ پھول ہیں؟...... ان میں تو خوشبو ہے نہ بدبو...... بہر حال اس نے وہ پھول سونگھے...... چند چیزیں خریدیں اور چلی گئی...... شام کو سردار بلونت سنگھ مجیٹھیا میری دکان پر آیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا...... کہ وہ پھول سنگھا دیئے؟ میں نے اس سے کہا۔ سنگھا تو

دیئے ہیں، لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلے گا، یہ مجھے معلوم نہیں۔ سردار بلونت سنگھ ہنسا۔ اس نے بڑے زور سے میرا ہاتھ دبایا اور کہا دوست! اب تمہارا کام سمجھو کہ پندرہ آنے ہو گیا ہے۔"

مجھے بڑی حیرت تھی کہ منتر کے ذریعے سے ایسا کام پندرہ آنے کیونکر ہو سکتا ہے، مگر سید صاحب نے کہنا شروع کیا۔ "منٹو صاحب! آپ یقین مانئے کہ میرا کام پندرہ آنے مکمل ہو گیا...... دوسرے دن کوکو جان کا ٹیلیفون آیا کہ وہ کچھ چیزیں خریدنے کے لیے آ رہی ہے، میں نے اس کا استقبال کیا...... وہ کوئی چیز خریدنا نہیں چاہتی تھی۔ بہت دیر تک وہ میری دکان میں ادھر ادھر پھرتی رہی۔ اس کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوئی، تم سے کئی مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ مجھے گھورا نہ کرو...... اور وہ جو تم نے پھول سنگھائے تھے، اس کا کیا مطلب تھا......"

میں نے کوکو جان سے لکنت بھرے لہجے میں کہا۔ "میں...... میں...... وہ پھول جو تھے...... پھول تھے...... میں نے...... میں نے...... مال جو چیکوسلوواکیہ سے آیا تھا، کھلا ہوا نہیں تھا اس لیے میں نے وہ پھول آپ کی خدمت میں پیش کر دیئے...... کوکو جان برقعے میں سخت مضطرب تھی...... اس نے اضطراب بھرے لہجے میں کہا۔ تم نے مجھے پھول کیوں سنگھائے؟"...... میں نے اس سے بڑے معصومانہ انداز میں پوچھا "کیا آپ کو اس سے کوئی تکلیف ہوئی......؟" وہ بڑے گرم انداز میں بولی "تکلیف......؟ میں ساری رات وہ سات پھول دیکھتی رہی ہوں...... پھول آتے تھے اور جب میں انہیں حاصل کرنا چاہتی تھی تو وہ مجھ سے پرے ہٹ جاتے تھے...... یہ کیسے پھول تھے؟ میں نے جواب دیا "میرے وطن کے تھے"

…… چونکہ میرے وطن کے تھے اس لیے میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیے …… لیکن مجھے حیرت ہے کہ وہ رات بھر آپ کو کیوں نظر آتے اور ستاتے رہے۔"

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا "یہ پھول آپ نے کہاں سے منگوائے تھے؟"

شاہ صاحب نے جواب دیا "جی! منگوائے کہاں سے تھے وہیں افغانستان کے تھے …… نہایت واہیات قسم کے پھول، جن میں خوشبو نام کو بھی نہیں تھی ……

شام کو سردار بلونت سنگھ آیا، مزید قرض لینے کے لیے۔ اس نے مجھ سے قرض لینے سے پہلے دریافت کیا، کہیے شاہ صاحب، اس معاملے کا کیا ہوا؟ میں نے اس کو ساری بات بتادی …… وہ قرض لینا بھول گیا۔ اپنا بالوں بھرا ہاتھ میرے کندھے پر زور سے مار کر چلایا۔ شاہ جی، آپ کا کام سولہ آنے ہو گیا ہے …… وسکی کی ایک بوتل منگائیے۔"

شاہ صاحب نے مجھے بتایا کہ انہوں نے وسکی کی بوتل کے علاوہ ایک ڈبہ سگریٹوں کا بھی منگوایا جس میں سے سردار بلونت سنگھ مجیٹھیا تمباکو نوشی کے ٹھیٹ انداز میں پے در پے کئی سگریٹ پھونکتے رہے۔ جب جانے لگے تو انہوں نے شاہ صاحب سے کہا کہ دیکھو ابھی تھوڑی سی کسر باقی ہے۔ اگلے منگو تم اور ساتھ پھول اور ان پر وہی منتر پڑھ کر اس لڑکی کو سنگھا دو …… بیڑا پار ہو جائے گا ……

شاہ صاحب بہت پریشان ہوئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اب کی کوکو جان کو پھول کیسے سنگھا سکیں گے جبکہ وہ اس معاملے کے متعلق شاکی تھی لیکن معاملہ عشق کا تھا، اس لیے شاہ صاحب موت کے منہ میں جانے کے لیے بھی تیار تھے۔

شاہ صاحب نے پشاور سے پھول منگوائے.........ان میں سے سات منتخب کیے اور ہر ایک پر منتر پڑھا اور اپنے میز کے گلدان میں رکھ دیئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی دکان میں جا بجا گلدان رکھوائے اور ان میں پھول سجا دیئے۔

پیر کو شاہ صاحب نے کوکو جان کو ٹیلیفون کیا اور اس سے پھر جھوٹ بولا کہ چیکو سلوواکیا کا مال کھل گیا ہے، آپ آیئے اور دیکھ لیجیے۔ کوکو جان آئی، مگر مال وال موجود نہیں تھا.........شاہ صاحب تھوڑی دیر کے لیے بوکھلائے، پھر ذرا ہوش سنبھال کر اپنے نوکروں کو لعن طعن کی کہ تم نے ابھی تک مال کیوں نہیں کھولا۔

کوکو جان کے ساتھ اس کی والدہ بوبو جان تھی۔ وہ ایک طرف ٹائلٹ کا سامان دیکھنے میں مصروف تھی۔ کوکو جان نے جب دکان میں جا بجا پھول دیکھے تو وہ متعجب ہونے کے علاوہ مضطرب بھی ہوئی۔

میرے میز پر وہ خاص پھول پڑے تھے۔ وہ ان کے پاس آئی گلدان میں سے اٹھا کر اس نے انہیں سونگھا اور مجھ سے کہا ''یہ افغانستان کے پھول نہیں۔''

میں نے جواب دیا۔ ''جی ہاں.........یہ میرے وطن کے ہیں.........اور میں نے خاص آپ کے لیے منگوائے ہیں۔ بوبو جان خرید و فروخت میں مشغول تھی۔ اس دوران میں کوکو جان سے میں نے اپنی والہانہ محبت کا اظہار کیا۔ وہ سخت ناراض ہوئی اور اپنی ماں کے ساتھ چلی گئی.........شام کو سردار بلونت سنگھ مجیٹھیا آیا.........اس سے بات چیت ہوئی۔ میں نے اس کو دس روپے قرض دیئے۔ جب اس نے روپے اپنی جیب میں ڈالے تو مجھ سے پوچھا۔ آج منگل ہے.........وہ پھول سنگھا دیئے تھے آپ نے؟.........میں نے سارا واقعہ بیان کر دیا.........سردار بلونت

سنگھ نے اپنا بالوں بھرا ہاتھ زور سے میرے ہاتھ پر مارا اور کہا، شاہ جی، اب کام سترہ آنے پورا ہو گیا ہے...... وسکی کی ایک بوتل منگاؤ۔"

شاہ صاحب نے وسکی کی بوتل منگائی۔ سردار بلونت سنگھ مجیٹھیا نے آدھی، دکان میں پی اور آدھی اپنے ساتھ لے گیا۔ میں نے شاہ صاحب سے پوچھا۔ "دوسری دفعہ پھول سنگھانے سے کیا نتیجہ برآمد ہوا۔"

شاہ صاحب نے جواب دیا "وہ بہت بے چین ہو گئی۔ اسے دن رات اتنے پھول نظر آنے لگے کہ ایک دن وہ سخت اضطراب کی حالت میں آئی۔ برقع جو اس نے کبھی اتارا نہیں تھا، کیلے کے چھلکے کی طرح اتار کر ایک طرف پھینکا اور مجھ سے مخاطب ہوئی "دیکھو شاہ! تم نے مجھ پر کوئی جادو کر دیا ہے...... میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا" جو مجھے پہلی بار نظر آیا تھا منٹو صاحب! میں نے اپنی زندگی میں اس جیسی حسین لڑکی اب تک نہیں دیکھی...... میں اس کو دیکھتا رہا...... اس نے بڑے تیز و تند لہجے میں کہا۔ "تم نے مجھے پھول کیوں سنگھائے تھے...... میں پاگل ہوئی جا رہی ہوں...... دن ہو یا رات، ہر وقت مجھے وہ تمہارے پھول دکھائی دیتے ہیں، مجھے معلوم ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں ایک شریف گھرانے کی لڑکی ہوں۔ میرے والدین عنقریب میری شادی کر رہے ہیں۔ تم نے مجھ پر یہ کیا جادو پھونکا ہے......" یہ کہہ کر اس نے میرے میز پر سے گلدان میں سے پھول نکالے اور فرش پر پھینک کر اپنی سینڈل سے مسل دیئے لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ ناراض ہونے کے باوجود ناراض نہیں تھی اور چاہتی تھی کہ میں اس سے باتیں کروں، لیکن مجھے اس کا یقین نہیں تھا اس لیے

میں خاموش رہا...... وہ کچھ دیر غصے کی حالت میں کھڑی رہی۔ اس کے بعد اس نے برقع پہنا اور چلی گئی۔"

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا "تو سردار بلونت سنگھ مجیٹھیا کا منتر کام کر گیا!"

"جی ہاں کام کر گیا...... اس کو پھول ہی پھول نظر آتے تھے میں نے کئی مرتبہ سوچا کہ یہ سب بکواس ہے، مگر گلو جان کی باتوں سے مجھے یقین ہو گیا کہ منتر اپنا اثر کر گیا ہے، حالانکہ جو منتر آپ سن چکے ہیں، اس میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے آدمی کو یہ معلوم ہو کہ وہ اثر کرے گا...... لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ جب پھر میری دکان میں آئی تو برقع اتار کر مجھ سے بغل گیر ہو گئی اور رونا شروع کر دیا۔ میں نے اس کو کئی مرتبہ چوما۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ تھوڑی دیر کے بعد میری میز پر گلدان میں جو پھول پڑے تھے اس نے نکالے اور انہیں نوچ کر ایک طرف پھینک دیا۔ اس کے بعد وہ برقع پہن کر تیزی سے باہر نکل گئی۔"

داستان کافی طوالت پکڑ رہی تھی۔ میں نے شاہ صاحب سے کہا "آپ مختصراً فرمائیے کہ انجام کیا ہوا؟...... کیا وہ لڑکی آپ کو مل گئی؟"

شاہ صاحب نے ایک آہ بھری۔ "جی نہیں...... اس کی شادی ہو گئی۔ مگر حجلۂ عروسی میں داخل ہوتے ہی معلوم نہیں کیا ہوا کہ وہ گری اور گرتے ہی مر گئی...... اس کے ہاتھ میں سات پھول تھے مختلف رنگوں کے۔"

میں نے دیکھا کہ شاہ صاحب کی پلنگڑی کے ساتھ تپائی پر پیتل کے پھولدان میں سات مختلف رنگوں کے پھول اڑسے ہوئے تھے۔

پھندنے

''پرے ہٹیے......''

''کیوں؟''

''مجھے آپ سے بو آتی ہے۔''

''ہر انسان کے جسم کی ایک خاص بو ہوتی ہے...... آج بیس برسوں کے بعد تمہیں اس سے تنفر کیوں محسوس ہونے لگا؟''

''بیس برس...... اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ میں نے اتنا طویل عرصہ کیسے بسر کیا ہے۔''

''میں نے کبھی آپ کو اس عرصہ میں تکلیف پہنچائی؟''

''جی کبھی نہیں۔''

''تو پھر آج اچانک آپ کو مجھ سے ایسی بو کیوں آنے لگی جس سے آپ کی ناک جو ماشاءاللہ کافی بڑی ہے اتنی غضب ناک ہو رہی ہے۔''

''آپ اپنی ناک تو دیکھئے...... پکوڑا سی ہے۔''

''میں اس سے انکار نہیں کرتا...... پکوڑے، تم جانتی ہو مجھے بہت پسند ہیں۔''

''آپ کو تو ہر واہیات چیز پسند ہوتی ہے...... کوڑے کرکٹ سے بھی آپ دلچسپی لیتے ہیں۔''

''کوڑا کرکٹ ہمارا ہی تو پھیلایا ہوتا ہے...... اس سے آدمی دلچسپی کیوں نہ لے...... اور تم جانتی ہو آج سے دس سال پہلے جب تمہاری ہیرے کی انگوٹھی گم ہو

گئی تھی تو اسی کوڑے کے ڈھیر سے میں نے تمہیں تلاش کر کے دی تھی۔''

''بڑا کرم کیا تھا آپ نے مجھ پر۔''

''بھئی کرم کا سوال نہیں...... فارسی کا ایک شعر ہے''

خاکساراں را بہ حقارت منگر

تو چہ دانی کہ وریں گرد سوارے باشد

''میں خاک بھی نہیں سمجھی۔''

''یہی وجہ ہے کہ تم نے ابھی تک مجھے نہیں سمجھا...... ورنہ بیس برس ایک آدمی کو پہچاننے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔''

''ان بیس برسوں میں آپ نے کون سا سکھ پہنچایا ہے مجھے؟''

''تم دکھ کی بات کرو...... بتاؤ میں نے کون سا دکھ تمہیں اس عرصے میں پہنچایا؟''

''ایک بھی نہیں۔''

''تو پھر یہ کہنے کا کیا مطلب تھا...... ان بیس برسوں میں آپ نے کون سا سکھ پہنچایا ہے مجھے؟''

''آپ میرے قریب نہ آئیے...... میں سونا چاہتی ہوں۔''

''اس غصے میں نیند آ جائے گی تمہیں؟''

''خاک آئے گی...... بہر حال...... آنکھیں بند کر کے لیٹی رہوں گی اور......''

''اور کیا کریں گی؟''

''لیٹی اس روز پر آنسو بہاؤں گی جب میں آپ کے پلے باندھی گئی۔''

"تمہیں یاد ہے وہ دن کیا تھا......سن کیا تھا......وقت کیا تھا؟"

"میں کبھی وہ دن بھول سکتی ہوں......خدا کرے وہ کسی لڑکی پر نہ آئے۔"

"تم بتا تو دو......میں تمہاری یادداشت کا امتحان لینا چاہتا ہوں۔"

"اب آپ میرا امتحان کیا لیں گے......پرے ہٹئے......مجھے آپ سے بو آ رہی ہے۔"

"بھئی حد ہوگئی ہے......تمہاری اتنی لمبی ناک جو کہیں ختم ہونے ہی میں نہیں آتی اس کو آخر کیا ہوگیا ہے......مجھ سے تو اس کو بڑی بھینی بھینی خوشبو آنا چاہیے......تم نے مجھ سے ان بیس برسوں میں ہزاروں مرتبہ کہا کہ آپ جب کسی کمرے میں داخل ہوں اور وہاں سے نکل جائیں تو میں پہچان جایا کرتی ہوں کہ آپ وہاں آئے تھے۔"

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"دیکھو......میں نے اپنی زندگی میں آج تک جھوٹ نہیں بولا......تم مجھ پر یہ الزام نہ دھرو۔"

"واہ جی واہ، بڑے آئے ہیں آپ کہیں کے سچے......میرا سو روپے کا نوٹ آپ نے چرایا اور صاف مکر گئے۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"دو جون سن انیس سو بیالیس کو......جب سلمیٰ میرے پیٹ میں تھی۔"

"یہ تاریخ تمہیں خوب یاد رہی۔"

"کیوں یاد نہ رہتی۔ جب آپ سے میری اتنی زبردست لڑائی ہوئی تھی۔ میں

اندر کمرے میں پڑی تھی۔ آپ نے چابی بڑی صفائی سے میرے تکیے کے نیچے سے نکالی۔ دوسرے کمرے میں جا کر الماری کھولی اور اس میں جو سات سو روپے تھے ان میں سے ایک نوٹ اڑا کر لے گئے۔ میں نے جب دو ڈھائی گھنٹوں کے بعد اٹھ کر دیکھا تو آپ سے پوچھ ہوئی۔ مگر آپ تھے کہ پروں پر پانی ہی نہیں لیتے تھے۔ آخر میں خاموش ہو گئی۔''

''یہ دو جون سن انیس سو بیالیس کی بات ہے...... آج کل سن چون چل رہا ہے۔ اب اس کے ذکر کا کیا فائدہ؟''

''فائدہ تو ہر حالت میں آپ ہی کا رہتا ہے...... میری ایک نیلم کی انگوٹھی بھی آپ نے غائب کر دی تھی، لیکن میں نے آپ سے کچھ نہیں کہا تھا۔''

''دیکھو میں تمہاری جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ اس نیلم کی انگوٹھی کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔''

''اور اس سو روپے کے نوٹ کے متعلق''

''اب تمہاری جان کی قسم کھائی ہے تو سچ سچ بتانا ہی پڑے گا...... میں نے...... میں نے چرایا ضرور تھا، مگر صرف اس لیے کہ اس مہینے مجھے تنخواہ دیر سے ملنے والی تھی اور تمہاری سالگرہ تھی۔ تمہیں کوئی تحفہ دینا تھا۔ ان بیس برسوں میں تمہاری ہر سالگرہ پر میں اپنی استطاعت کے مطابق کوئی نہ کوئی تحفہ پیش کرتا رہا ہوں۔''

''بڑے تحفے تحائف دیئے ہیں آپ نے مجھے۔''

''ناشکری تو نہ بنو۔''

''میں کئی دفعہ کہہ چکی ہوں، آپ پرے ہٹ جائیے...... مجھے آپ سے بو آتی ہے۔''

”کس کی؟“

”یہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔“

”میں نے خود کوئی مرتبہ سونگھا ہے، مگر میری پکوڑا ایسی ناک میں ایسی کوئی بو نہیں گھسی۔ جس پر کسی بیوی کو اعتراض ہو سکے۔“

”آپ باتیں بنانا خوب جانتے ہیں۔“

”اور باتیں بگاڑنا تم..... میری سمجھ میں نہیں آتا آج تم اس قدر ناراض کیوں ہو۔“

”اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیے۔“

”میں اس وقت قمیض پہنے نہیں ہوں۔“

”کیوں؟“

”سخت گرمی ہے۔“

”سخت گرمی ہو یا نرم..... آپ کو قمیض تو نہیں اتارنا چاہیے تھی۔ یہ کوئی شرافت نہیں۔“

”محترمہ! آپ نے بھی تو قمیض اتار رکھی ہے..... اپنے ننگے بدن کو ملاحظہ فرمائیے۔“

”اوہ..... یہ میں نے کیا واہیات پن کیا ہے۔“

”یہ واہیات پن تو آپ گرمیوں میں بیس برس سے کر رہی ہیں۔“

”آپ جھوٹ بولتے ہیں۔“

”خیر جھوٹ بولنا تو ہر مرد کی عادت ہوتی ہے۔“

”آپ مجھ سے دور ہی رہیں۔“

''کیوں؟''

''توبہ...... لاکھ بار کہہ چکی ہوں کہ مجھے آپ سے بہت گندی بو آرہی ہے۔''

''پہلے صرف بو تھی...... اب گندی ہوگئی۔''

''خبردار، جو آپ نے مجھے ہاتھ لگایا۔''

''اس قدر بیزاری آخر کیوں؟''

''میں اب آپ سے قطعاً بیزار ہو چکی ہوں۔''

''ان بیس برسوں میں تم نے کبھی ایسی بیزاری کا اظہار نہیں کیا تھا۔''

''اب تو کر دیا ہے۔''

''لیکن مجھے معلوم تو ہو کہ اس کی وجہ کیا ہے۔''

''میں کہتی ہوں، مجھے مت چھوئیے۔''

''تمہیں مجھ سے اتنی کراہت کیوں ہو رہی ہے۔''

''آپ ناپاک ہیں...... بے حد ذلیل ہیں۔''

''دیکھو، تم بہت زیادتی کر رہی ہو۔''

''آپ نے کم کی ہے۔ کوئی شریف آدمی آپ کی طرح ایسی ذلیل حرکت نہیں کرسکتا تھا۔''

''کون سی؟''

''آج صبح کیا ہوا تھا؟''

''آج صبح؟...... بارش ہوئی تھی۔''

''بارش ہوئی تھی...... لیکن اس بارش میں آپ نے کس کو اپنی آغوش میں

دبایا ہوا تھا؟''

''اوہ!''

''بس اس کا جواب اب ''اوہ'' ہی ہوگا...... میں نے پکڑ جو لیا آپ کو۔''

''دیکھو میری جان............''

''مجھے اپنی جان وان مت کہیے...... آپ کو شرم آنی چاہیے۔''

''کس بات پر...... کس گناہ پر؟''

''میں کہتی ہوں آدمی گناہ کرے...... لیکن ایسی گندگی میں نہ گرے۔''

''میں کس گندگی میں گرا ہوں؟''

''آج صبح آپ نے اس...... اس......''

''کیا؟''

''اس بھنگن کو...... جوان بھنگن کو جو مٹھائی والے کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔''

''لاحول ولا...... تم بھی عجیب عورت ہو...... وہ غریب حاملہ ہے بارش میں جھاڑو دیتے ہوئے اس کو غش آیا اور گر پڑی۔ میں نے اس کو اٹھایا اور اس کے کوارٹر میں لے گیا۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''تمہیں معلوم نہیں کہ وہ مر گئی؟''

''ہائے...... بے چاری...... میں تو ٹھنڈی برف ہوگئی ہوں۔''

''میرے قریب آ جاؤ...... میں قمیض پہن لوں؟''

''اس کی کیا ضرورت ہے؟ تمہاری قمیض میں ہوں۔''

بیگو

تسلیاں اور دلاسے بےکار ہیں۔ لوہے اور سونے کے یہ مرکب میں چھٹانکوں پھانک چکا ہوں۔ کون سی دوا ہے جو میرے حلق میں نہیں اتاری گئی۔ میں آپ کے اخلاق کا ممنون ہوں مگر ڈاکٹر صاحب میری موت یقینی ہے۔ آپ کیسے کہہ رہے ہیں کہ میں دق کا مریض نہیں۔ کیا میں ہر روز خون نہیں تھوکتا؟ آپ یہی کہیں گے کہ یہ میرے گلے اور دانتوں کی خرابی کا نتیجہ ہے مگر میں سب جانتا ہوں۔ میرے دونوں پھیپھڑے خانہ زنبور کی طرح مشک ہو چکے ہیں☆ آپ کے انجکشن مجھے دوبارہ زندگی نہیں بخش سکتے۔ دیکھئے، میں اس وقت آپ سے باتیں کر رہا ہوں مگر سینے پر ایک وزنی انجن دوڑتا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک تاریک گڑھے میں اتر رہا ہوں...... قبر بھی تو ایک تاریک گڑھا ہے۔ آپ میری طرف اس طرح نہ دیکھئے ڈاکٹر صاحب، مجھے اس چیز کا کامل احساس ہے کہ آپ اپنے ہسپتال میں کسی مریض کا مرنا پسند نہیں کرتے مگر جو چیز اٹل ہے وہ ہو کے رہے گی۔ آپ ایسا کیجئے کہ مجھے یہاں سے رخصت کر دیجئے۔ میری ٹانگوں میں تین چار میل چلنے کی قوت ابھی باقی ہے۔ کسی قریب کے گاؤں میں چلا جاؤں گا اور...... مگر میں تو رو رہا ہوں۔ نہیں نہیں۔ ڈاکٹر صاحب یقین کیجئے میں موت سے خائف نہیں۔ یہ میرے جذبات ہیں، جو آنسوؤں کی شکل میں باہر نکل رہے ہیں۔ آہ! آپ کیا جانیں۔ اس مدقوق سینے سے کیا کچھ باہر نکلنے کو مچل رہا ہے میں اپنے انجام سے باخبر ہوں۔ آج سے پانچ برس پہلے بھی میں اس وحشت ناک

انجام سے باخبر تھا، جانتا تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ کچھ عرصے بعد میری زندگی کی ڈوری ختم ہو جائے گی۔ میں نے اس گیند کو جسے آپ زندگی کے نام سے پکارتے ہیں، خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار کر کاٹا ہے۔ اس میں کسی کا قصور نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اس کھیل میں لذت محسوس کر رہا ہوں۔ لذت ...... ہاں لذت ...... میں نے اپنی زندگی کی کئی راتیں حسن فروش عورتوں کے تاریک اڈوں پر گزاری ہیں۔ شراب کے نشے میں چور میں نے کس بیدردی سے خود کو اس حالت پر پہنچایا۔ مجھے یاد ہے انہی اڈوں کی سیاہ پیشہ عورت ...... کیا نام تھا اس کا؟...... ہاں گلزار مجھے اس بری طرح اپنی جوانی کو کیچڑ میں لت پت کرتے دیکھ کر مجھ سے ہمدردی کرنے لگ گئی تھی۔ بے وقوف عورت، اس کو کیا بتاتا کہ میں اس کیچڑ میں کس کا عکس دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے گلزار اور دیگر ہم پیشہ عورتوں سے نفرت تھی اور اب بھی ہے، لیکن کیا آپ مریضوں کو زہر نہیں کھلاتے اگر اس سے اچھے نتائج کی امید ہو۔ میرے درد کی دوا ہی تاریک زندگی تھی۔ میں نے بڑی کوششوں اور مصیبتوں کے بعد اس انجام کو بلایا ہے۔ جس کی کچھ روداد آپ نے میرے سرہانے ایک تختی پر لکھ کر لٹکا رکھی ہے۔ میں نے اس کے انتظار میں ایک ایک گھڑی کس بیتابی سے کاٹی ہے، آہ! کچھ نہ پوچھئے لیکن اب مجھے دلی تسکین حاصل ہو چکی ہے۔ میری زندگی کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ میں دق اور سل کا مریض ہوں۔ اس مرض نے مجھے کھوکھلا کر دیا ہے ...... آپ حقیقت کا اظہار کیوں نہیں کر دیتے بخدا اس سے مجھے اور تسکین حاصل ہو گی۔ میرا آخری سانس آرام سے نکلے گا ...... ہاں ڈاکٹر صاحب تو یہ بتائیے، کیا آخری لمحات واقعی تکلیف دہ ہوتے

ہیں؟ میں چاہتا ہوں میری جان آرام سے نکلے۔ آج میں واقعی بچوں کی سی باتیں کر رہا ہوں۔ آپ اپنے دل میں یقیناً مسکراتے ہوں گے کہ میں آج معمول سے بہت زیادہ باتونی ہو گیا ہوں ...... دیا جب بجھنے کے قریب ہوتا ہے تو اس کی روشنی تیز ہو جایا کرتی ہے۔ کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟............ آپ تو بولتے ہی نہیں اور میں ہوں کہ بولے جا رہا ہوں۔ ہاں ...... ہاں ...... بیٹھیے ...... میرا جی چاہتا ہے کہ آج کسی سے باتیں کیے جاؤں۔ آپ نہ آتے تو خدا معلوم میری کیا حالت ہوتی ...... آپ کا سفید سوٹ آنکھوں کو کس قدر بھلا معلوم ہو رہا ہے۔ کفن بھی اسی طرح صاف ستھرا ہوتا ہے۔ پھر آپ میری طرف اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں۔ آپ کو کیا معلوم کہ میں مرنے کے لیے کس قدر بے تاب ہوں۔ اگر مرنے والوں کو کفن خود پہننا ہو تو آپ دیکھتے میں اس کو کتنی جلدی اپنے گرد لپیٹ لیتا۔ میں کچھ عرصہ اور زندہ رہ کر کیا کروں گا؟ کہ وہ مر چکی ہے، میرا زندہ رہنا فضول ہے۔ میں نے اس موت کو بہت مشکلوں کے بعد اپنی طرف آمادہ کیا ہے اور اب میں اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دے سکتا۔ وہ مر چکی ہے اور اب میں بھی مر رہا ہوں۔ میں نے اپنی سنگ دلی .... وہ مجھے سنگ دل کے نام سے پکارا کرتی تھی، کی قیمت ادا کر دی ہے اور خدا گواہ ہے کہ اس کا کوئی سکہ بھی کھوٹا نہیں۔ میں پانچ سال تک ان کو پرکھتا رہا ہوں۔ میری عمر اس وقت پچیس برس کی ہے۔ آج سے ٹھیک سات برس پہلے میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ آہ، ان سات برسوں کی روداد کتنی حیرت افزا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کی تفصیل کاغذوں پر پھیلا دے تو انسانی دلوں کی داستانوں میں کیسا دلچسپ اضافہ ہو۔ دنیا ایک ایسے دل کی دھڑکن

سے آشنا ہو گی۔ جس نے اپنی غلطی کی قیمت خون کی ان تھوکوں میں ادا کی ہے۔ جنہیں آپ ہر روز جلاتے رہتے ہیں۔ کہ ان کے جراثیم دوسروں تک نہ پہنچیں ...... آپ میری بکواس سنتے سنتے کیا تنگ تو نہیں آ گئے خدا معلوم کیا کیا کچھ بکتا رہا ہوں۔ تکلف سے کام نہ لیجیے۔ آپ واقعی کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ میں خود کچھ نہیں سمجھ سکا۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ بٹوت سے واپس آ کر میرے دل و دماغ کا ہر جوڑ ہل گیا تھا۔ اب یعنی آج جب کہ میرے جنون کا دورہ ختم ہو چکا ہے اور موت کو چند قدم کے فاصلے پر دیکھ رہا ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ وزن جو میری چھاتی کو دابے ہوئے تھا ہلکا ہو گیا ہے اور میں پھر زندہ ہو رہا ہوں موت وزن جو میری چھاتی کو دابے ہوئے تھا ہلکا ہو گیا ہے اور میں پھر زندہ ہو رہا ہوں موت میں زندگی ...... کیسی دلچسپ چیز ہے آج میرے ذہن سے دھند کے تمام بادل اٹھ گئے ہیں۔ میں ہر چیز کو روشنی میں دیکھ رہا ہوں۔ سات برس پہلے کے تمام واقعات اس وقت میری نظروں کے سامنے ہیں۔ دیکھیے ...... میں لاہور سے گرمیاں گزارنے کے لیے کشمیر کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ سوٹ سلوائے جا رہے ہیں۔ ہولڈال اور ٹرنک کپڑوں سے پر کیے جا رہے ہیں۔ میں رات کی گاڑی سے جموں روانہ ہوتا ہوں۔ شمیم میرے ساتھ ہے۔ گاڑی کے ڈبے میں بیٹھ کر ہم عرصہ تک باتیں کرتے رہتے ہیں۔ گاڑی چلتی ہے۔ شمیم چلا جاتا ہے۔ میں سو جاتا ہوں۔ دماغ ہر قسم کی فکر سے آزاد ہے۔ صبح جموں کے اسٹیشن پر جاگتا ہوں کشمیر کی حسین وادی کی ہونے والی سیر کے خیالات میں مگن لاری پر سوار ہوتا ہوں۔ بٹوت سے ایک میل کے فاصلے پر لاری کا پہیہ پنکچر ہو جاتا ہے شام کا وقت ہے۔ اس لیے

رات بٹوت کے ایک ہوٹل میں کاٹنا پڑتی ہے۔ اس ہوٹل کا کمرہ مجھے بے حد غلیظ معلوم ہوتا ہے مگر کیا معلوم تھا کہ وہاں پر مجھے پورے دو مہینے رہنا پڑے گا۔ صبح سویرے اٹھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ لاری کے انجن کا ایک پرزہ بھی خراب ہو گیا ہے اس لیے مجبوراً ایک دن اور بٹوت میں ٹھہرنا پڑے گا۔ یہ سن کر میری طبیعت کس قدر افسردہ ہو گئی تھی اس افسردگی کو دور کرنے .... میں اس روز شام کو سیر کے لیے نکلتا ہوں۔ چیڑ کے درختوں کا تنفس، جنگلی پرندوں کی نغمہ سرائیاں سیب کے درختوں کا حسن اور غروب ہوتے سورج کا دل کش سماں۔ لاری والے کی بے احتیاطی اور رنگ میں بھنگ ڈالنے والی تقدیر کی گستاخی کا رنج افزا خیال محو کر دیتا ہے۔ میں نیچر کے مسرت افزا مناظر سے لطف اندوز ہوتا سڑک کے ایک موڑ پر پہنچتا ہوں۔ دفعتاً میری نگاہیں اس سے دوچار ہوتی ہیں۔ بیگو مجھ سے بیس قدم کے فاصلے پر اپنی بھینس کے ساتھ کھڑی ہے .... جس داستان کا انجام اس وقت آپ کے پیش نظر ہے اس کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔

وہ جوان تھی۔ اس کی جوانی پر بٹوت کی فضا پوری شدت کے ساتھ جلوہ گر تھی سبز لباس میں ملبوس وہ سڑک کے درمیان مکئی کا ایک دراز قد بوٹا معلوم ہو رہی تھی چہرے کے تانبے ایسے تابیاں رنگ پر اس کی آنکھوں کی چمک نے ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی تھی جو چشمے کے پانی کی طرح صاف اور شفاف تھیں ....

میں اس کو کتنا عرصہ دیکھتا رہا۔ یہ مجھے معلوم نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ میں نے دفعتاً اپنا سینہ موسیقی سے لبریز پایا اور پھر میں مسکرا دیا۔ اس کی بھٹکی ہوئی نگاہوں کی توجہ بھینس سے ہٹ کر میرے تبسم سے ٹکرائی۔ میں گھبرا گیا۔ اس نے ایک تیز تجسس سے میری

طرف دیکھا۔ جیسے وہ کسی بھولے ہوئے خواب کو یاد کر رہی ہے پھر اس نے اپنی چھڑی کو دانتوں میں دبا کر کچھ سوچا اور مسکرا دی۔ اس کا سینہ چشمے کے پانی کی طرح دھڑک رہا تھا۔ میرا دل بھی میرے پہلو میں انگڑائیاں لے رہا تھا............ آہ یہ پہلی ملاقات کس قدر لذیذ تھی۔ اس کا ذائقہ ابھی تک میرے جسم کی ہر رگ میں موجود ہے...... وہ چلی گئی...... میں اس کو آنکھوں سے اوجھل ہوتے دیکھتا رہا۔ وہ اس انداز سے چل رہی تھی جیسے کچھ یاد کر رہی ہے۔ کچھ یاد کرتی ہے مگر پھر بھول جاتی ہے اس نے جاتے ہوئے پانچ چھ مرتبہ میری طرف مڑ کر دیکھا لیکن فوراً ہی سر پھیر لیا جب وہ اپنے گھر میں داخل ہوگئی جو سڑک کے نیچے مکئی کے چھوٹے سے کھیت کے ساتھ بنا ہوا تھا۔ میں اپنی طرف متوجہ ہوا۔ میں اس کی محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اس احساس نے مجھے سخت متحیر کیا۔ میری عمر اس وقت اٹھارہ سال کی تھی۔ کالج میں اپنے ہم جماعت طلبہ کی زبانی میں محبت کے متعلق سن چکا تھا۔ عشیقہ داستانیں بھی اکثر میرے زیر مطالعہ رہی تھیں۔ مگر محبت کے متعلق سن چکا تھا۔ عشقیہ داستانیں بھی اکثر میرے زیر مطالعہ رہی تھیں۔ مگر محبت کے حقیقی معنی میرے نظروں سے پوشیدہ تھے۔ اس کے جانے کے بعد جب میں نے ایک ناقابل بیان تلخی اپنے دل کی دھڑکنوں میں حل ہوتی ہوئی محسوس کی تو میں نے خیال کیا شاید اسی کا نام محبت ہے............ یہ محبت ہی تھی............ عورت سے محبت کرنے کا پہلا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ مرد کی ہو جائے، یعنی وہ اس سے شادی کر لے۔ وہ آرام سے اپنی بقایا زندگی گزار دے۔ شادی کے بعد یہ محبت کروٹ بدلتی ہے۔ پھر مرد اپنی محبوبہ کے کاندھوں پر ایک گھر تعمیر کرتا ہے۔ میں نے جب بیگو کو

اپنے دل سے وابستہ ہوتے محسوس کیا تو فطری طور پر میرے دل میں اس رفیقۂ حیات کا خیال پیدا ہوا جس کے متعلق میں اپنے کمرے کی چار دیواری میں کئی خواب دیکھ چکا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی میرے دل سے یہ صدا اٹھی۔ ''دیکھو سعید یہ لڑکی ہی تمہارے خوابوں کی پری ہے۔'' چنانچہ میں تمام واقعے پر غور کرتا ہوا ہوٹل واپس آیا اور ایک ماہ کے لیے ہوٹل کا وہ کمرہ کرائے پر اٹھا لیا جو مجھے بے حد غلیظ محسوس ہوا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہوٹل کا مالک میرے اس ارادے کو سن کر بہت متحیر ہوا تھا۔ اس لیے کہ میں صبح اس کی غلاظت پسندی پر ایک طویل لیکچر اسے دے چکا تھا۔ داستان کتنی طویل ہوتی جا رہی ہے، مگر مجھے معلوم ہے کہ آپ اسے غور سے سن رہے ہیں...... ہاں ہاں آپ سگریٹ سلگا سکتے ہیں۔ میرے گلے میں آج کھانسی کے آثار محسوس نہیں ہوتے۔ آپ کی ڈبیہ دیکھ کر میرے ذہن میں ایک اور واقعہ کی یاد تازہ ہو گئی ہے۔ بیگو بھی سگریٹ پیا کرتی تھی۔ میں نے کئی بار اسے گولڈ فلیک کی یہ ڈبیاں لا کر دی تھیں۔ وہ بڑے شوق سے ان کو منہ میں دبا کر دھوئیں کے بادل اڑایا کرتی تھی۔ دھواں......... میں اس نیلے نیلے دھوئیں کو اب بھی دیکھ رہا ہوں جو اس کے گیلے ہونٹوں پر رقص کیا کرتا تھا...... ہاں تو دوسرے روز میں شام کو اسی وقت ادھر سیر کو گیا۔ جہاں مجھے وہ سڑک پر ملی تھی۔ دیر تک سڑک کے ایک کنارے پتھروں کی ایک دیوار پر بیٹھا رہا۔ مگر وہ نظر نہ آئی...... اٹھا اور ٹہلتا آگے نکل گیا۔ سڑک کے دائیں ہاتھ ڈھلوان تھی جس پر چیڑ کے درخت اگے ہوئے تھے۔ بائیں ہاتھ بڑے بڑے پتھروں کے کٹے پھٹے سر ابھر رہے تھے۔ ان پر جمی ہوئی مٹی کے ڈھیلوں میں گھاس

اگی ہوئی تھی۔ ہوا ٹھنڈی اور تیز تھی۔ پیڑ کے تاگا نما پتوں کی سرسراہٹ کانوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ جب موڑ مڑا تو دفعتاً میری نگاہیں سامنے اٹھیں مجھ سے سو گز کے فاصلے پر وہ اپنی بھینس کو ایک سنگین حوض میں پانی پلا رہی تھی۔ میں قریب پہنچا۔ مگر اس کو نظر بھر کر دیکھنے کی جرأت نہ کر سکا اور آگے نکل گیا اور جب واپس مڑا تو وہ گھر جا چکی تھی۔ اب ہر روز اس طرف سیر کو جانا میرا معمول ہو گیا۔ مگر بیس روز تک میں اس سے ملاقات نہ کر سکا۔ میں نے کئی بار باؤلی پر پانی پیتے وقت اس سے ہم کلام ہونے کا ارادہ کیا۔ مگر زبان گنگ ہو گئی۔ کچھ بول نہ سکا قریباً ہر روز میں اس کو دیکھتا۔ مگر رات کو جب میں تصور میں اس کی شکل دیکھنا چاہتا تو ایک دھند سی چھا جاتی۔ یہ عجیب بات ہے کہ میں اس کی شکل کو اس کے باوجود کہ اسے ہر روز دیکھتا تھا۔ بھول جاتا تھا۔ بیس دنوں کے بعد ایک روز چار بجے کے قریب جب کہ میں ایک باؤلی کے اوپر پیڑ کے سائے میں لیٹا تھا۔ وہ ایک خورد سال لڑکے کو لے کر اوپر چڑھی۔ اس کو اپنی طرف آتا دیکھ کر میں سخت گھبرا گیا۔ دل میں یہی آئی کہ وہاں سے بھاگ جاؤں لیکن اس کی سکت بھی نہ رہی۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر آگے نکل گئی۔ چونکہ اس کے قدم تیز تھے۔ اس لیے لڑکا پیچھے رہ گیا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ دفعتاً لڑکے نے ایک چیخ ماری اور چشم زدن میں پیڑ کے خشک پتوں پر سے پھسل کر نیچے آ رہا۔ میں فوراً اٹھا اور بھاگ کر اسے اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔ چیخ سن کر وہ مڑی اور دوڑنے کے بڑھے ہوئے قدم روک کر آہستہ آہستہ میری طرف آئی۔ اپنی جوان آنکھوں سے مجھے دیکھا اور لڑکے سے یہ کہا۔ ”خدا جانے تم کیوں گر گر پڑتے ہو؟“

میں نے گفتگو شروع کرنے کا ایک موقع پا کر اس سے کہا۔ ''بچہ ہے، اس کی انگلی پکڑ لیجیے۔ ان چھوں نے خود مجھے کئی بار اوندھے منہ گرا دیا ہے۔''

یہ سن کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''آپ کے ہیٹ نے تو خوب لڑھکنیاں کھائی ہوں گی۔''

''آپ ہنستی کیوں ہیں؟ کسی کو گرتے دیکھ کر آپ کی طبیعت اتنی شاد کیوں ہوتی ہے اور جو کسی روز آپ گر پڑیں تو .... وہ گھڑا جو ہر روز بھر کر شام کے وقت آپ گھر لے جاتی ہیں۔ کس بری طرح زمین پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔''

''میں نہیں گر سکتی ....'' یہ کہتے ہوئے اس نے دفعتاً نیچے باؤلی کی طرف دیکھا اس کی بھینس نالی پر بندھے ہوئے پل کی طرف خراماں جا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر اس نے اپنے حلق سے ایک عجیب قسم کی آواز نکالی۔ اس کی گونج ابھی تک میرے کانوں میں محفوظ ہے۔ کس قدر جوان تھی یہ آواز، اس نے بڑھ کر لڑکے کو کاندھے پر اٹھا لیا اور بھینس کو، اے چھلاں، اے چھلا کے نام سے پکارتی ہوئی چشم زدن میں نیچے اتر گئی۔ بھینس کو واپس موڑ کر اس نے میری طرف دیکھا اور گھر کو چل دی...... اس ملاقات کے بعد اس سے ہم کلام ہونے کی جھجک دور ہو گئی۔ ہر روز شام کے وقت باؤلی پر یا چیڑ کے درختوں تلے میں اس سے کوئی نہ کوئی بات شروع کر دیتا۔ شروع شروع میں ہماری گفتگو کا موضوع بھینس تھا۔ پھر میں نے اس سے اس کا نام دریافت کیا اور اس نے میرا اس کے بعد گفتگو کا رخ اصل مطلب کی طرف آ گیا۔ ایک روز دوپہر کے وقت جب وہ نالے میں ایک بڑے

سے پتھر پر بیٹھی اپنے کپڑے دھو رہی تھی میں.........اس کے پاس بیٹھ گیا۔ مجھے کسی خاص بات کا اظہار کرنے پر تیار دیکھ کر اس نے جنگلی بلی کی طرح میری طرف گھور کر دیکھا اور زور زور سے اپنی شلوار کو پتھر پر جھٹکتے ہوئے کہا۔

''آپ کشمیر کب جا رہے ہیں۔ جہاں بوٹ میں کیا دھرا ہے جو آپ یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔''

یہ سن کر میں نے مستفسرانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ گویا میں اس کے سوال کا جواب خود اس کی زبان سے چاہتا ہوں۔ اس نے نگاہیں نیچی کر لیں اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ سیر کرنے کے لیے آئے ہیں۔ میں نے سنا ہے کشمیر میں بہت سے باغ ہیں۔ آپ وہاں کیوں نہیں چلے جاتے؟''

موقع اچھا تھا۔ چنانچہ میں نے دل کے تمام دروازے کھول دیئے۔ وہ میرے جذبات کے بہتے ہوئے دھارے کا شور خاموشی سے سنتی رہی۔ میری آواز نالے کے پانی کی گنگناہٹ میں جو ننھے سنگریزوں سے کھیلتا ہوا بہہ رہا تھا۔ ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی۔ ہمارے سروں کے اوپر اخروٹ کے گھنے درخت میں چڑیاں چہچہا رہی تھیں ہوا اس قدر تازہ لطیف تھی کہ اس کا ہر جھونکا بدن پر ایک خوشگوار کپکپی طاری کر دیتا تھا۔ میں اس سے پورا ایک گھنٹہ گفتگو کرتا رہا۔ اس سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور شادی کا خواہشمند ہوں۔ یہ سن کر وہ بالکل متحیر نہ ہوئی لیکن اس کی نگاہیں جو دور پہاڑیوں کی سیاہی اور آسمان کی نیلاہٹ کو آپس میں ملتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔ اس بات کی مظہر تھیں کہ وہ کسی گہرے خیال میں مستغرق ہے کچھ عرصہ خاموش رہنے کے بعد اس نے

میرے اصرار پر صرف اتنا جواب دیا۔

''اچھا آپ کشمیر نہ جائیں۔''

یہ جواب اختصار کے باوجود حوصلہ افزا تھا...... اس ملاقات کے بعد ہم دونوں بے تکلف ہو گئے۔ اب پہلا سا حجاب نہ رہا۔ ہم گھنٹوں ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے رہتے۔ ایک روز میں نے اس سے نشانی کے طور پر کچھ مانگا تو اس نے بڑے بھولے انداز سے اپنے سر کے دو کلپ اتار کر میری ہتھیلی پر رکھ دیئے اور مسکرا کر کہا۔ ''میرے پاس یہی کچھ ہے۔'' یہ کلپ میرے پاس ابھی تک محفوظ ہیں۔ خیر، کچھ دنوں کی طول طویل گفتگوؤں کے بعد میں نے اس کی زبان سے کہلوا لیا کہ وہ مجھ سے شادی کرنے پر رضامند ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب اس روز شام کو اس نے اپنے گھڑے کو سر پر سنبھالتے ہوئے اپنی رضامندی کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ ''ہاں میں چاہتی ہوں۔'' تو میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ہوٹل کو واپس آتے ہوئے کچھ گایا تھا۔ اس پر مسرت شام کے چوتھے روز جب کہ میں آنے والی ساعت سعید کے خواب دیکھ رہا تھا۔ یکا یک اس مکان کی تمام دیواریں گر پڑیں جن کو میں نے بڑے پیار سے استوار کیا تھا۔ بستر میں پڑا تھا کہ صبح سیالکوٹ کے ایک صاحب جو بغرض تبدیلی آب و ہوا بٹوت میں قیام پذیر تھے اور ایک حد تک بیگو سے میری محبت کو جانتے تھے۔ میری چارپائی پر بیٹھ گئے اور نہایت ہی متفکرانہ لہجہ میں کہنے لگے:

''وزیر بیگم سے ملاقاتوں کا ذکر آج بٹوت میں ہر بچے کی زبان پر ہے میں وزیر بیگم کے کیریکٹر سے ایک حد تک واقف تھا۔ اس لیے کہ سیالکوٹ میں اس لڑکی

کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں مگر یہاں بٹوت میں اس کی تصدیق ہو گئی ہے، ایک ہفتہ پہلے یہاں کا قصائی اس کے متعلق ایک طویل حکایت سنا رہا تھا۔ پرسوں پان والا آپ سے ہمدردی کا اظہار کر رہا تھا کہ آپ عصمت باختہ لڑکی کے دام میں پھنس گئے ہیں۔ کل شام کو ایک اور صاحب کہہ رہے تھے کہ آپ ایک ٹوٹی ہوئی ہنڈیا خرید رہے ہیں۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ بعض لوگ اس سے آپ کی گفتگو پسند نہیں کرتے۔ اس لیے کہ آپ جب سے بٹوت میں آئے ہیں وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ میں نے آپ سے حقیقت کا اظہار کر دیا ہے۔ اب آپ بہتر سوچ سکتے ہیں۔"

عصمت باختہ لڑکی، ٹوٹی ہوئی ہنڈیا، لوگ اس سے میری گفتگو پسند نہیں کرتے مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آتا تھا۔ بیگو اور.......... اس کا خیال ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مگر جب دوسرے روز مجھے ہوٹل والے نے نہایت ہی رازدرانہ لہجے میں چند باتیں کہیں تو میری آنکھوں کے سامنے تاریک سی دھند چھا گئی۔ "بابو جی! آپ بٹوت میں سیر کے لیے آئے ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ آپ یہاں کی حسن فروش لڑکی کی محبت میں گرفتار ہیں۔ اس کا خیال اپنے دل سے نکال دیجیے۔ میرا اس لڑکی کے گھر آنا جانا ہے، مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ نے اس کو کچھ کپڑے بھی خرید دیئے ہیں آپ نے یقیناً اور بھی روپے خرچ کیے ہوں گے۔ معاف کیجیے مگر یہ سراسر حماقت ہے۔ میں آپ سے یہ باتیں ہرگز نہ کرتا۔ کیونکہ یہاں بیسیوں عیش پسند مسافر آتے ہیں۔ مگر آپ کا دل ان سیاہیوں سے پاک نظر آتا ہے۔ آپ بٹوت سے چلے جائیں اس قماش کی لڑکی سے گفتگو کرنا اپنی عزت کو خطرے میں

ڈالنا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان باتوں نے مجھے بے حد افسردہ بنا دیا ہے۔ وہ مجھ سے سگریٹ، مٹھائی اور اسی قسم کی دوسری معمولی چیزیں طلب کیا کرتی تھی اور میں بڑے شوق محبت سے اس کی یہ خواہش پوری کیا کرتا تھا۔ اس میں ایک خاص لطف تھا مگر اب ہوٹل والے کی بات نے میرے ذہن میں مہیب خیالات کا تلاطم برپا کر دیا۔ گزشتہ ملاقاتوں کے جتنے نقوش میرے دل و دماغ میں محفوظ تھے اور جنہیں میں ہر روز بڑے پیار سے اپنے تصور میں لا کر ایک خاص قسم کی مٹھاس محسوس کیا کرتا تھا۔ دفعتاً تاریک شکل اختیار کر گئے۔ مجھے اس کے نام ہی سے عفونت آنے لگی۔ میں نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی بہت ہی کوشش کی مگر بے سود۔ میرا دل جو ایک کالج کے طالب علم کے سینے میں دھڑکتا تھا اپنے خوابوں کی یہ بری اور بھیانک تعبیر دیکھ کر چلا اٹھا۔ اس کی باتیں جو کچھ عرصہ پہلے مجھے بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ ریا کاری میں ڈوبی ہوئی معلوم ہونے لگیں............ میں نے گزشتہ واقعات، بیگو کی نقل و حرکت، اس کی ہر جنبش اور اپنے گرد و پیش کے ماحول کو پیش نظر رکھ کر عمیق مطالعہ کیا۔ تو تمام چیزیں روشن ہو گئیں۔ اس کا ہر شام کو ایک مریض کے ہاں دودھ لے کر جانا اور وہاں ایک عرصہ تک بیٹھی رہنا۔ باؤلی پر ہر کس و ناکس سے بیباکانہ گفتگو، دوپٹے کے بغیر ایک پتھر سے دوسرے پتھر پر اچھل کود، اپنی ہم عمر لڑکیوں سے کہیں زیادہ شوخی اور آزادی"............ "وہ یقیناً عصمت باختہ لڑکی ہے۔" میں نے یہ رائے مرتب تو کر لی۔ مگر آنسوؤں سے میری آنکھیں گیلی ہو گئیں۔ خوب رویا مگر دل کا بوجھ ہلکا نہ ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ ایک بار اور آخری بار اس سے ملوں اور اس کے منہ پر تمام غصے کو تھوک دوں۔ یہی صورت تھی جس سے

مجھے کچھ سکون ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں شام کو باؤلی کی طرف گیا۔ وہ پگڈنڈی پر انار کی جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر میرا دل کس قدر کڑھا۔ میرا حلق اس روز کی تلخی کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اس کے قریب پہنچا اور پاس ہی ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ چھلاں اس کی بھینس اس کا بچھڑا چند گزوں پر بیٹھے جگالی کر رہے تھے۔ میں نے گفتگو کا آغاز کرنا چاہا۔ مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ غصے اور افسردگی نے میری زبان پر قفل لگا دیا۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی، جیسے چشمے کے پانی میں کسی نے اپنے مٹی بھرے ہاتھ دھو دیئے ہیں۔ پھر وہ مسکرائی۔ یہ مسکراہٹ مجھے کسی قدر مصنوعی اور پھیکی معلوم ہوئی۔ میں نے سر جھکا لیا اور سنگریزوں سے کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ شاید میرا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور کہا ''آپ بیمار ہیں؟''

اس کا یہ کہنا تھا کہ میں برس پڑا۔ ''ہاں بیمار ہوں، یہ بیماری تمہاری دی ہوئی ہے۔ تمہیں نے یہ روگ لگایا ہے۔ بیگو! میں تمہارے چال چلن کی سب کہانی سن چکا ہوں اور تمہارے سارے حالات سے باخبر ہوں۔''

میری چبھتی ہوئی یہ باتیں سن کر اور بدلے ہوئے تیور دیکھ کر وہ بھونچکا سی رہ گئی اور کہنے لگی۔ ''اچھا تو میں اچھی لڑکی نہیں ہوں۔ آپ کو میرے چال چلن کے متعلق سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔''

میں چلایا۔ ''گویا تم کو معلوم نہیں۔ ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو تو اپنی سیہ کاریوں کا سارا نقشہ تمہاری آنکھوں تلے گھوم جائے گا۔'' میں طیش میں آ

گیا۔ ''کتنی بھولی بنتی ہو، جیسے کچھ جانتی ہی نہیں۔ پردوں پر پانی ہی نہیں پڑنے دیتیں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں، بھلا تم کیا سمجھو جاؤ جاؤ بیگو تم نے مجھے سخت دکھ پہنچایا ہے۔'' یہ کہتے کہتے میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

وہ بھی سخت مضطرب ہوگئی اور جل کر بول اٹھی۔ ''آخر میں بھی تو سنوں کہ آپ نے میرے بارے میں کیا کیا سنا ہے۔ پر آپ تو رو رہے ہیں۔''

''ہاں رو رہا ہوں، اس لیے کہ تمہارے افعال ہی اتنے سیاہ ہیں کہ ان پر ماتم کیا جائے۔ تم پاکبازوں کی قدر کیا جانوں۔ اپنا جسم بیچنے والی لڑکی محبت کیا جانے۔ تم...... تم صرف اتنا جانتی ہو کہ کوئی مرد آئے اور تمہیں اپنی چھاتی سے بھینچ کر چومنا چاٹنا شروع کردے اور جب سیر ہو جائے تو اپنی راہ لے۔ کیا یہی تمہاری زندگی ہے۔''

میں غصے کی شدت میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ جب اس نے میری زبان سے اس قسم کے سخت کلمات سنے تو اس نے ایسا ظاہر کیا جیسے اس کی نظر میں یہ سب گفتگو ایک معمہ ہے۔ اس وقت طیش کی حالت میں میں نے اس کی حیرت کو نمائشی خیال کیا اور ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''جاؤ میری نظروں سے دور ہو جاؤ، تم ناپاک ہو۔''

یہ سن کر اس نے ڈری ہوئی آواز میں صرف اتنا کہا۔ ''آپ کو کیا ہو گیا ہے؟''

''مجھے کیا ہو گیا ہے...... کیا ہو گیا ہے۔'' میں پھر برس پڑا۔ ''اپنی زندگی کی سیہ کاریوں پر نظر دوڑاؤ تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ تم میری بات اس لیے نہیں سمجھتی ہو کہ میں تم سے شادی کرنے کا خواہشمند تھا۔ اس لیے کہ میرے سینے

میں شہوانی خیالات موجود نہیں، اس لیے کہ میں صرف محبت کرتا ہوں۔ جاؤ مجھے تم سے سخت نفرت ہے۔"

جب میں بول چکا تو اس نے تھوک نگل کر اپنے گلے کو صاف کیا اور تھرتھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "شاید آپ یہ خیال کرتے ہوں گے کہ جان بوجھ کر انجان بن رہی ہوں مگر سچ جانئے مجھے کچھ معلوم نہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک شام آپ سڑک پر سے گزر رہے تھے آپ نے میری طرف دیکھا تھا اور مسکرا دیئے تھے۔ یہاں بیسیوں لوگ ہم لڑکیوں کو دیکھتے ہیں اور مسکرا کر چلے جاتے ہیں۔ پھر آپ متواتر باؤلی کی طرف آتے رہے۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ میرے لیے آتے ہیں مگر اسی قسم کے کئی واقعے میرے ساتھ گزر چکے ہیں۔ ایک روز آپ نے میرے ساتھ باتیں کیں اور اس کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ آپ نے شادی کے لیے کہاں اور میں مان گئی۔ مگر اس سے پہلے اسی قسم کی کئی درخواستیں سن چکی ہوں جو مرد بھی مجھ سے ملتا ہے۔ دوسرے تیسرے روز میرے کان میں کہتا ہے۔ بیگو! دیکھ میں تیری محبت میں گرفتار ہوں، رات دن تو ہی میرے دل و دماغ میں بسی رہتی ہے۔ آپ نے مجھ سے یہی کہا۔ آپ بتائیے محبت کیا چیز ہے۔ مجھے کیا معلوم کہ آپ نے دل میں چھپا رکھا ہے یہاں آپ جیسے کئی لوگ ہیں جو مجھ سے یہی کہتے رہتے ہیں۔ بیگو تمہاری آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ صدقے ہو جاؤں۔ تمہارے ہونٹ کس قدر پیارے ہیں۔ جی چاہتا ہے ان کو چومے جاؤں...... وہ مجھے چومتے رہتے ہیں۔ کیا یہ محبت نہیں؟ کئی بار میرے دل میں خیال آیا ہے کہ محبت کچھ اور ہی چیز ہے مگر

میں پڑھی لکھی نہیں اس لیے مجھے کیا معلوم ہو سکتا ہے۔ میں نے قاعدہ پڑھنا شروع کیا مگر چھوڑ دیا۔ اگر میں پڑھوں تو پھر چھلاں اور اس کے بچھڑے کا پیٹ کون بھرے۔ آپ اخبار پڑھ لیتے ہیں۔ اس لیے آپ کی باتیں بڑی ہوتی ہیں۔ میں کچھ نہیں سمجھ سکتی۔ چھوڑیئے اس قصے کو۔ آیئے کچھ اور باتیں کریں۔ مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ میری ماں کہہ رہی تھیں کہ بیگو تو ہیٹ والے بابو کے پیچھے دیوانی ہوگئی ہے۔"

میری نظروں کے سامنے سے وہ تاریک پردہ اٹھنے لگا تھا۔ جو اس انجام کا باعث تھا۔ مگر دفعتاً میرے جوش اور غصے نے پھر اسے گرا دیا۔ بیگو کی گفتگو بے حد سادہ اور معصومیت سے پر تھی۔ مگر مجھے اس کا ہر لفظ بناوٹ میں لپٹا نظر آیا۔ میں نے ایک لمحہ بھی اس کی اہمیت پر غور نہ کیا۔

"بیگو میں بچہ نہیں ہوں کہ تم مجھے چکنی چپڑی باتوں سے بے وقوف بنالوگی۔" میں نے غصہ میں اس سے کہا۔ "یہ فریب کسی اور کو دینا۔ کہتے ہیں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے تم نے ابھی ابھی اپنی زبان سے اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ اب میں کیا کہوں............"

"نہیں............نہیں............کہیے۔" اس نے کہا۔

"کئی لوگ تمہارے منہ کو چومتے رہے ہیں۔ تمہیں شرم آنی چاہیے۔"

"ہائے آپ تو سمجھتے ہی نہیں۔ اب میں کیا جھوٹ بولتی ہوں۔ میں خود تھوڑا ہی ان کے پاس جاتی ہوں اور منہ بڑھا کر چومنے کو کہتی ہوں۔ اگر آپ اس روز میرے بالوں کو چومنا چاہتے۔ جب کہ آپ ان کی تعریف کر رہے تھے تو کیا میں

انکار کر دیتی؟ میں کس طرح انکار کر سکتی ہوں۔ مجھے چاِلاں بہت پیاری لگتی ہے اور میں اس کو ہر روز چومتی ہوں۔ اس میں کیا ہرج ہے میں چاہتی ہوں کہ لوگ میرے بالوں، میرے ہونٹوں اور میرے گالوں کی تعریف کریں اس سے مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ خبر نہیں کیوں؟ میں صبح سویرے اٹھتی ہوں اور چاِلاں کو لے کر گھاس چرانے کے لیے باہر چلی جاتی ہوں۔ بارہ بجے روٹی کھا کر پھر گھر سے نکل آتی ہوں۔ شام کو پانی بھرتی ہوں۔ ہر روز میرا یہی کام ہے۔ مجھے یاد ہے آپ نے مجھ سے کئی مرتبہ کہا تھا کہ میں پانی بھرنے نہ آیا کروں، بھینس نہ چرایا کروں۔ شاید آپ اسی وجہ سے ناراض ہو رہے ہیں۔ مگر یہ تو بتائیے کہ میں گھر پر رہوں تو پھر آپ مجھ سے ملاقات کیونکر کر سکیں گے؟ میں نے سنا ہے کہ پنجاب میں لڑکیاں گھر سے باہر نہیں نکلتیں مگر ہم پہاڑی لوگ ہیں، ہمارا یہی کام ہے۔"

"تمہارا یہی کام ہے کہ ہر راہ گزر سے لپٹنا شروع کر دو۔ تم پہاڑی لوگوں کے چلن مجھ سے چھپے ہوئے نہیں، یہ تقریر کسی اور کو سنانا۔ گھر پر رہو یا باہر پھرو۔ اب مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ان پہاڑیوں میں رہ کر جو سبق تم نے سیکھا ہے وہ مجھے پڑھانے کی کوشش نہ کرو۔"

"آپ بہت تیز ہوتے جا رہے ہیں، بہت چل نکلے ہیں۔" اس نے قدرے بگڑ کر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے لوگوں نے آپ کے بہت کان بھرے ہیں۔ مجھے بھی تو پتہ لگے کہ وہ کون مرن جوگے ہیں جو میرے متعلق آپ کو ایسی باتیں سنا رہے ہیں۔ آپ خواہ مخواہ اتنے گرم ہوتے جا رہے ہیں یہ سچ ہے کہ مردوں کے ساتھ باتیں کرتی ہوں اور ان سے ملتی ہوں مگر........" یہ کہتے ہوئے اس کے گال

سرخ ہو گئے مگر میں نے اس کی طرف دھیان نہ دیا۔ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولی۔ ”آپ کہتے ہیں کہ میں بری لڑکی ہوں۔ یہ غلط ہے۔ میں پگلی ہوں .... سچ مچ پگلی ہوں، کل آپ کے جانے کے بعد میں پتھر پر بیٹھ کر دیر تک روتی رہی۔ جانے کیوں۔ ایسا کئی دفعہ ہوا ہے کہ میں گھنٹوں رویا کرتی ہوں، آپ ہنسیں گے۔ مگر اس وقت بھی میرا جی چاہتا ہے کہ یہاں سے اٹھ بھاگوں اور اس پہاڑی کی چوٹی پر بھاگتی ہوئی چڑھ جاؤں اور پھر کودتی پھاندتی نیچے اتر آؤں۔ میرے دل میں ہر وقت ایک بے چینی رہتی ہے۔ بھینس چراتی ہوں، پانی بھرتی ہوں لکڑیاں کاٹتی ہوں لیکن یہ سب کام میں اوپرے دل سے کرتی ہوں۔ میرا جی کسی کو ڈھونڈتا ہے معلوم نہیں کس کو .... میں دیوانی ہوں۔“

بیگو کی یہ عجیب غریب باتیں جو در حقیقت اس کی زندگی کا ایک نہایت الجھا ہوا باب تھیں اور جسے بغور مطالعہ کرنے کے بعد سب راز حل ہو سکتے تھے۔ اس وقت مجھے کسی مجرم کا غیر مربوط بیان معلوم ہوئیں۔ بیگو اور میرے درمیان اس قدر تاریک اور موٹا پردہ حائل تھا کہ حقیقت کی نقاب کشائی بہت مشکل تھی۔

”تم دیوانی ہو“ میں نے اس سے کہا۔ ”کیا مردوں کے ساتھ بیٹھ کر جھاڑیوں کے پیچھے پہروں باتیں کرتے رہنا بھی اس دیوانگی ہی کی ایک شاخ ہے؟ .... بیگم تم دیوانی ہو مگر اپنے کام میں آٹھوں گانٹھ ہوشیار!“

”میں باتیں کرتی ہوں، ان سے ملتی ہوں۔ میں نے کب اس سے انکار کیا ہے۔ ابھی ابھی میں نے آپ سے اپنے دل کی سچی بات کہی تو آپ نے مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ اب اگر میں کچھ اور کہوں تو اس سے کیا فائدہ ہوگا، آپ کبھی

مانیں گے ہی نہیں۔‘‘

’’نہیں نہیں، کہو، کیا کہتی ہو۔ تمہارا نیا فلسفہ بھی سن لوں۔‘‘

’’سنیے پھر! یہ کہہ کر اس نے تھکی ہوئی ہرنی کی طرح میری طرف دیکھا‘‘ اور آہ بھر کر بولی۔ ’’یہ باتیں جو میں آج آپ کو سنانے لگی ہوں، میری زبان سے پہلے کبھی نہیں نکلیں۔ میں یہ آپ کو بھی نہ سناتی مگر مجبوری ہے۔ آپ عجیب وغریب آدمی ہیں۔ میں بہت سے لوگوں سے ملتی رہی ہوں مگر آپ بالکل نرالے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے آپ سے .... ’’وہ ہچکچائی۔ ’’ہاں آپ سے پیار ہو گیا ہے۔ آپ نے کبھی مجھ سے غیر بات نہیں کی حالانکہ میں جس سے ملتی رہی ہوں۔ وہ مجھ سے کچھ اور ہی کہتا تھا۔ میری اماں جانتی ہے کہ میں گھر میں ہر وقت آپ ہی کی باتیں کرتی ہوں۔ میرا منہ تھکتا ہی نہیں۔ آپ کے آنے پر میں نے گاہکوں کے پاس دودھ لے جانا چھوڑ دیا ہے۔ لوگوں سے باتیں کرنا بند کر دیں۔ پانی بھرنے کے لیے بھی زیادہ تر چھوٹی بہن کو بھیجتی رہی ہوں۔ آپ کے آنے سے پہلے میں لوگوں سے ملتی رہی ہوں۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میں ان سے کیوں ملتی تھی .... مجھے کوئی مرد بھی بلاتا تو میں اس سے باتیں کرنے لگتی اس لیے نہیں، میں نہیں بتاؤں گی .... میرا دل جو چاہتا تھا۔ وہ ان لوگوں کے پاس نہیں تھا، میں بری نہیں، اللہ کی قسم، بے گناہ ہوں، خدا معلوم لوگ مجھے برا کیوں کہتے ہیں آپ بھی مجھے برا کہتے ہیں۔ جس طرح آپ نے آج میرے منہ پر اتنی گالیاں دی ہیں۔ اگر آپ کی بجائے کوئی اور ہوتا تو میں اس کا منہ نوچ لیتی مگر آپ .... اب میں کیا کہوں، میں بہت بدل گئی ہوں۔ آپ اچھے آدمی ہیں۔

میں خیال کرتی تھی کہ آپ مجھے کچھ سکھائیں گے۔ مجھے اچھی باتیں سنائیں گے لیکن آپ مجھ سے خواہ مخواہ لڑ رہے ہیں.......... آپ کو کیا معلوم کہ میں آپ کی کتنی قدر کرتی ہوں میں نے آپ کے سامنے کبھی گالیاں نہیں دیں، حالانکہ ہمارے گھر سارا دن گالی گلوچ ہوتی رہتی ہے۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب! اس پیاری لڑکی کی گفتگو کس قدر سادہ تھی مگر افسوس ہے کہ اس وقت میرے کانوں میں روئی ٹھنسی ہوئی تھی۔ اس کے ہر لفظ سے مجھے عصمت فروشی کی بو آ رہی تھی۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔"

"بیگم تم ہزار قسمیں کھاؤ مگر مجھے یقین نہیں آتا۔ اب جو تمہارے جی میں آئے کرو میں کل بٹوت چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ میں نے تم سے محبت کی مگر تم نے اس کی قدر نہ کی۔ تم نے میرے دل کو بہت دکھ دیا ہے.......... خیر اب جاتا ہوں۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔"

مجھے جاتا دیکھ کر وہ سخت مضطرب ہوگئی اور میرا بازو پکڑ کر اور پھر اسے فوراً ہی ڈرتے ہوئے چھوڑ کر تھرائی ہوئی آواز میں صرف اس قدر کہا۔ "آپ جا رہے ہیں؟"

میں نے جواب دیا۔ "ہاں جا رہا ہوں تاکہ تمہارے چاہنے والوں کے لیے میدان صاف ہو جائے۔"

"آپ نہ جائیے۔ اللہ کی قسم میرا کوئی چاہنے والا نہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ "نہ جائیے، نہ جائیے نہ.........." آخری الفاظ اس کی

گلوگیر آواز میں دب گئے اس کا رونا میرے دل پر کچھ اثر نہ کر سکا۔ میں چل پڑا۔ مگر اس نے مجھے بازو سے پکڑ لیا اور روتی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ خفا کیوں ہو گئے ہیں۔ میں آئندہ کسی آدمی سے بات نہ کروں گی۔ اگر آپ نے مجھے کسی مرد کے ساتھ دیکھا تو آپ اس چھڑی سے جتنا چاہیے۔ پیٹ لیجیے۔ آیئے گھر چلیں، میں آپ کے لیے حقہ تازہ کر کے لاؤں گی۔"

میں خاموش رہا اور اس کا ہاتھ چھوڑ کر پھر چل پڑا۔ اس وقت بیگو سے ایک منٹ کی گفتگو کرنا بھی مجھے گراں گزر رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ لڑکی میری نظروں سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جائے۔ میں نے بمشکل دو گز کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ وہ میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس کے بال پریشان تھے۔ آنکھوں کے ڈورے سرخ اور ابھرے ہوئے تھے۔ سینہ آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا۔

اس نے پوچھا۔ "کیا آپ واقعی جا رہے ہیں؟"

میں نے تیزی سے جواب دیا۔ "تو اور کیا جھوٹ بک رہا ہوں۔"

"جایئے!"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے اشک رواں تھے اور گال آنسوؤں کی وجہ سے میلے ہو رہے تھے۔ مگر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک ناچ رہی تھی۔

"جایئے!" یہ کہہ کر وہ الٹے پاؤں مڑی۔ اس کا قد پہلے سے لمبا ہو گیا تھا۔

میں نے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دور جا کر میں نے جھاڑیوں کے پیچھے سے رونے کی آواز سنی۔ وہ رو رہی تھی .... وہ تھرائی ہوئی آواز ابھی تک

میرے کانوں میں آ رہی ہے۔

"یہ ہے میری داستان ڈاکٹر صاحب، میں نے اس پہاڑی لڑکی کی محبت کو ٹھکرا دیا۔ اس غلطی کا احساس مجھے پورے دو سال بعد ہوا۔ جب میرے ایک دوست نے مجھے یہ بتایا کہ بیگو نے میرے جانے کے بعد اپنے شباب کو دونوں ہاتھوں سے لٹانا شروع کر دیا اور دق کے مریضوں سے ملنے کی وجہ سے وہ خود اس کا شکار ہو گئی۔ پھر بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ اس مرض نے بالآخر اسے قبر کی گود میں سلا دیا .... اس کی موت کا باعث میرے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ وہ زندگی کی شاہراہ پر اپنا راستہ تلاش کرتی تھی مگر میں اس کو بھول بھلیوں میں چھوڑ کر بھاگ آیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھٹک گئی۔ میں مجرم تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے لیے وہی موت تجویز کی جس سے وہ دوچار ہوئی۔ وہ وزن جو میں پانچ سال اپنی چھاتی پر اٹھائے پھرتا رہا ہوں، خدا کا شکر ہے کہ اب ہلکا ہو گیا ہے۔"

میں مریض کی داستان خاموشی سے سنتا رہا۔ وہ بول چکا تو پھر بھی خاموش رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے جذبات پر رائے زنی کروں۔ چنانچہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا مجھے کئی مریضوں کی داستانیں سننے کا اتفاق ہوا ہے مگر یہ نہایت عجیب و غریب اور پر اثر داستان تھی۔ گو مریض بیماری کی وجہ سے ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ مگر حیرت ہے کہ اس نے اپنے طویل بیان کو کس طرح جاری رکھا۔

صبح کے وقت میں اس کا ٹمپریچر دیکھنے کے لیے آیا مگر وہ مر چکا تھا۔ سفید چادر اوڑھے وہ بڑے سکون سے سو رہا تھا۔

جب اس کو غسل دینے لگے تو ہسپتال کے ایک نوکر نے مجھے بلایا اور کہا۔

''ڈاکٹر صاحب اس کی مٹھی میں کچھ ہے۔ میں نے اس کی بند مٹھی کو آدھا کھول کر دیکھا۔ لوہے کے دو کلپ تھے۔ اس کی بیگو کی یادگار۔''

''ان کو نکالنا نہیں یہ اس کے ساتھ ہی دفن ہوں گے۔'' میں نے غسل دینے والوں سے کہا اور دل میں غم کی ایک عجیب وغریب کیفیت لیے دفتر چلا گیا۔



پریشانی کا سبب

نعیم میرے کمرے میں داخل ہوا اور خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا اور اخبار کی آخری کاپی کے لیے جو مضمون لکھ رہا تھا اس کو جاری رکھنے ہی والا تھا کہ معاً مجھے نعیم کے چہرے پر ایک غیر معمولی تبدیلی کا احساس ہوا۔ میں نے چشمہ اتار کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''کیا بات ہے نعیم! معلوم ہوتا ہے تمہاری طبیعت ناساز ہے۔''

نعیم نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری اور جواب دیا۔ ''کیا بتاؤں، عجب مشکل میں جان پھنس گئی ہے۔ بیٹھے بٹھائے ایک ایسی بات ہوئی ہے کہ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔''

میں نے کاغذ کی جتنی پرچیاں لکھی تھیں جمع کر کے ایک طرف رکھ دیں اور زیادہ دلچسپی لے کر اس سے پوچھا ''کوئی حادثہ پیش آ گیا.......... فلم کمپنی میں کسی ایکٹرس سے..........''

نعیم نے فوراً ہی کہا۔ ''نہیں بھائی! ایکٹرس ویکٹرس سے کچھ بھی نہیں ہوا۔ ایک اور ہی مصیبت میں جان پھنس گئی ہے۔ تمہیں فرصت ہو تو میں ساری داستان سناؤں۔''

نعیم میرا دوست ہے۔ جب سے وہ بمبئی آیا ہے اس سے میری دوستی چلی آ رہی ہے۔ وہ یوں کہ بمبئی آتے ہی اس نے میرے اخبار میں کام کیا اور خود کو بہت سی اہلیتوں کا مالک ثابت کیا۔ پھر آہستہ آہستہ جب مجھے اس کے اعلیٰ خاندان کا پتا

چلا اور اسی قسم کی دوسری واقفیتیں نکلتی آئیں تو میرے دل میں اس کی عزت اور بھی زیادہ ہو گئی، چنانچہ چھ مہینے کے مختصر عرصے ہی میں وہ میرا بے تکلف دوست بن گیا۔

نعیم نے میرے اخبار کو دلچسپ بنانے کے لیے مجھ سے زیادہ کوششیں کیں۔ ہر ہفتے جب اس نے ایک نئی کہانی لکھنا شروع کی اور میں نے اس کی تین چار کہانیاں پڑھیں تو مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ اخبار میں اگر نعیم پڑا رہا تو اس کی تمام ذکاوتیں تباہ ہو جائیں گی، چنانچہ میں نے موقع ملتے ہی ایک فلم کمپنی میں اس کی سفارش کی اور وہ مکالمہ نگار کی حیثیت سے فوراً ہی وہاں ملازم ہو گیا۔

فلم کمپنی کی ملازمت کے دوران میں نعیم نے وہاں کے سیٹھوں اور ڈائریکٹوں پر کیسا اثر ڈالا، اس کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں۔ میں بے حد مصروف آدمی ہوں لیکن نعیم سے ایک دو بار مجھے اتنا ضرور معلوم ہوا تھا کہ وہاں اس کا کام پسند کیا گیا ہے۔ اب ایکا ایکی نہ جانے کیا حادثہ پیش آیا تھا جو اس کا رنگ یوں ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا تھا۔

نعیم بے حد شریف آدمی ہے۔ اس سے کسی نامعقول حرکت کی توقع ہی نہیں ہو سکتی تھی، میں سخت متحیر ہوا کہ ایسی کون سی افتاد پڑی جو نعیم کسی کو اپنا منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ میں نے اس سے اجازت لے کر جلدی جلدی آخری کاپی کے لیے مضمون کا بقایا حصہ مکمل کیا اور تمام پرچیاں کاتب کر دے کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''بھئی معاف کرنا میں فوراً ہی تمہاری داستان نہ بن سکا............ لیکن میں پوچھتا ہوں یہ داستان آخر بنی کیسے؟............ تم............ تم............ خیر چھوڑو اس قصے کو، تم مجھے سارا

واقعہ سناؤ۔‘‘

نعیم نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور کہا۔ ’’اب میں تمہیں کیا بتاؤں، جو کچھ ہوا، میری اپنی بیوقوفی کی بدولت ہوا۔ ہماری فلم کمپنی میں ایک ایکٹر ہے۔ عاشق حسین، اول درجے کا چغد ہے۔ چونکہ دوسروں کی طرح اسے ستاتا نہیں ہوں اس لیے وہ مجھ پر بری طرح فریفتہ ہے، یہ فریفتہ میں نے اس لیے کہا ہے کہ وہ مجھ سے اسی طرح باتیں کرتا ہے جس طرح خوبصورت عورتوں سے کی جاتی ہیں۔‘‘

میں ہنس پڑا۔ ’’پر تم اتنے خوبصورت تو نہیں ہوا۔‘‘

نعیم کے پیلے چہرے پر بھی ہنسی کی لال لال دھاریاں پھیل گئیں۔ ’’کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا ہے۔ دراصل وہ اپنے اخلاص اور اپنی بے لوث محبت کا اظہار کرنا چاہتا ہے اور چونکہ اسے ایسا کرنے کا طریقہ نہیں آتا اس لیے اس کا پیار وہی شکل اختیار کر لیتا ہے جو اس کو غالباً اپنی بیوی سے ہوگا...... ہاں تو یہ عاشق حسین صاحب جو اول درجے کے رقاص ہیں اور رقص کے سوا اور کچھ بھی نہیں جانتے پرسوں شوٹنگ کے بعد مجھے ملے۔ سیٹ پر میں نے ان کے مکالمے درست کرنے میں کافی محنت کی تھی۔ اس کا حق ادا کرنے کے لیے انہوں نے فوراً ہی کچھ سوچا اور کہا۔ نعیم صاحب! میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’فرمائیے۔‘‘ انہوں نے پھر کچھ سوچا اور کہا۔ ’’دن بھر کام کرنے کے بعد میں بہت تھک گیا ہوں۔ آپ بھی ضرور تھک گئے ہوں گے۔ چلیے کہیں گھوم آئیں۔‘‘ اب میں یہاں اپنی ایک کمزوری بتا دوں۔ موسم اگر خوشگوار ہو تو میں عموماً بہک جاتا

ہوں۔ شام کا جھٹپٹا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور فضا میں ایک عجیب قسم کی اداسی گھلی ہوئی تھی۔ جوان کنوارے آدمیوں کے دل میں ایسی اداسی ضرور موجود ہوتی ہے جو پھیل کر ایسے موقعوں پر بہت وسعت اختیار کر لیا کرتی ہے۔ میرے بدن پر ایک کپکپی سی طاری ہوگئی جب میں نے جوہو کے سمندری کنارے کا تصور کیا جہاں شام کو نم آلود ہوائیں یوں چلتی ہیں جیسے بھاری بھاری ریشمی ساڑھیاں پہن کر عورتیں چلتی ہیں۔ میں فوراً تیار ہو گیا۔ ''چلیے...... مگر کہاں جائیے گا'' اب عاشق حسین نے پھر سوچا اور کہا۔ ''کہیں بھی چلے چلیں گے...... یہاں سے باہر تو نکلیں۔'' ہم دونوں گیٹ سے باہر نکلے اور موٹر بس کا انتظار کرنے لگے۔

یہاں تک کہہ کر نعیم رک گیا۔ اس کے چہرے کی زردی اب دور ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا اور کہا۔ ''تم دونوں گیٹ سے باہر نکل کر بس کا انتظار کرنے لگے۔''

نعیم نے سر ہلایا۔ ''اور شامتِ اعمال ادھر سے عاشق حسین کے ایک مارواڑی دوست کا گزر ہوا۔ وہ موٹر میں جا رہا تھا کہ اچانک عاشق حسین کی نظر اس پر پڑی۔ فوراً ہی اس نے مارواڑی زبان میں اپنے دوست کو ٹھہرنے کے لیے کہا۔ موٹر رکی، عاشق حسین نے اس سے مارواڑی زبان میں چند باتیں کیں پھر دوڑ کر میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ چلیے...... کام بن گیا۔ موٹر مل گئی۔ اسی میں چلتے ہیں۔'' میں چل پڑا موٹر میں داخل ہونے سے پہلے عاشق نے اپنے مارواڑی دوست سے جو شکل و صورت کے اعتبار سے ڈرائیور معلوم ہوتا تھا تعارف کرایا اور حسب معمول مبالغے سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ مارواڑ کے بہت بڑے سیٹھ ہیں۔ یہاں ایک

کاروبار کے سلسلے میں آ ے ہیں۔ میرے بہت مہربان دوست ہیں۔'' اور میرے متعلق اپنے دوست سے کہا۔ ''ہندوستان کے بہت بڑے اسٹوری رائٹر ہیں۔'' ہندوستان کے بہت بڑے اسٹوری رائٹر اور مارواڑ کے بہت بڑے سیٹھ نے ہاتھ ملائے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ رسمی طور پر خوش ہوئے اور موٹر چلی۔ یہ سن کر میں مسکرایا۔ ''نعیم! اس مارواڑی سیٹھ کے متعلق تمہاری رائے بہت خراب معلوم ہوتی ہے، کیا آگے چل کر یہ ولن کا پارٹ ادا تو نہیں کرے گا۔''

''تم پہلے پوری داستان سن لو، پھر سوچنا کہ ولن کون ہے اور ہیرو کون لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کہانی کی ہیروئن زہرہ ہے............ زہرہ جس کو میں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کل وادر کی ایک فوجداری عدالت میں دیکھا ہے............ ایک مجرم کی حیثیت میں۔''

یہ کہتے ہوئے نعیم کے کان کی لویں شرم کے باعث سرخ ہو گئیں۔ داستان سننے کے دوران میں پہلی مرتبہ زہرہ کے اچانک ذکر سے مجھے سخت تعجب ہوا میں نے کہا۔ ''نعیم! یہ تو بالکل الگونڈ پو کا افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ زہرہ بالکل پو کے افسانوں کے غیر متوقع انجام کی طرح اس داستان میں آئی ہے۔ یہ عورت کون ہے؟''

''میں قطعاً نہیں جانتا۔ یعنی اگر مجھے اس عورت کے متعلق کچھ علم ہو تو مجھ پر لعنت۔ خدا معلوم کون ہے، پر اب میں اتنا جانتا ہوں کہ اس نے ہم لوگوں پر فوجداری مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔ جرم ڈاکہ اور چوری ہے۔''

میں نے تعجب سے پوچھا۔ ''ڈاکہ اور چوری۔''

نعیم کے لہجے نے ایسی متانت اختیار کر لی جس میں روحانی اذیت کی جھلک صاف دکھائی دیتی تھی۔ کہنے لگا۔ ''ہاں...... ڈاکہ اور چوری مجھے دفعات اچھی طرح یاد نہیں مگر ان کا مطلب یہی ہے کہ ہم نے مداخلت بے جا کی، زہرہ کے گھر پر ڈاکہ ڈالا اور اس کی چند قیمتی اشیاء چرا کر لے گئے، لیکن یہ تو داستان کا انجام ہے۔ پہلے کے واقعات تمہیں سنا لوں پھر اس طرف آتا ہوں...... میں کیا کہہ رہا تھا؟''

میں نے جواب دیا۔ ''یہ کہ تم اس مارواڑی کی موٹر میں بیٹھ گئے۔''

''ہاں میں عاشق حسین کے کہنے پر اس منحوس مارواڑی کی موٹر میں بیٹھ گیا۔ موٹر وہ خود چلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اگلی سیٹ پر ایک اور آدمی بیٹھا تھا جو اس سے کم منحوس نہیں تھا۔ عاشق حسین نے شاید اس کے متعلق کہا تھا کہ وہ موٹریں بنانے کا کام کرتا ہے۔ خیر موٹر مختلف بازاروں سے ہوتی ہوئی دادر کی طرف جانکلی ظاہر تھا کہ ہم جوہو جائیں گے، چنانچہ میں بہت خوش تھا جوہو کی گیلی گیلی ریت سے مجھے بے حد پیار ہے۔ کبھی کبھی ادھر جا کر میں گیلی ریت پر ضرور لیٹا کرتا ہوں اور دیر تک کھلے آسمان کی طرف دیکھا کرتا ہوں جو اتنا ہی پراسرار اور ناقابل رسا دکھائی دیتا ہے جتنا ایک اجنبی عورت کا تصور...... سامنے رات کی سرمئی روشنی میں سمندر کروٹیں لیتا ہے، اوپر گدلے آسمان پر تارے یوں چمکتے ہیں جیسے انہونی باتیں کسی جوان آدمی کے دل میں ٹمٹما رہی ہوں۔ ایک عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ دور اس پار جہاں آسمان اور سمندر کوئی واضح خط بنائے بغیر آپس میں گھل مل جاتے ہیں۔ ایک ایسی دھندلی روشنی نظر آیا کرتی ہے جو خوبصورت شعروں کی طرح

مصنوعی ہوتی ہے...... میں جوہو کی سیر کے خیال میں مگن تھا کہ عاشق حسین نے موٹر کو دادری میں ایک جگہ ٹھہرالیا اور مجھ سے کہا چلیے............ کچھ پی لیں۔'' جیسا کہ تمہیں معلوم ہے، بیئر مجھے پیاری ہے۔ عاشق حسین کو خدا معلوم کہاں سے اس بات کا پتا چلا تھا کہ میں پیا کرتا ہوں۔ خیر............ ہم چاروں داخل ہوئے۔ ایک بوتل بیئر کی میں نے پی اور ایک عاشق حسین نے۔ مارواڑی سیٹھ اور موٹریں بنانے والے نے کچھ نہ پیا۔ ہم جلدی ہی فارغ ہو گئے۔ پھر موٹر میں بیٹھے اور جوہو کا رخ کیا مگر فوراً ہی عاشق حسین کو ایک کام یاد آ گیا۔ ''اوہ مجھے تو اپنی شاگرد زہرہ کے ہاں جانا ہے۔ آج اس سے ملنے کا میں نے وعدہ کیا تھا...... نعیم صاحب اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو پانچ منٹ لگیں گے۔ اس کا مکان بالکل قریب ہے۔'' مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا، چنانچہ اس نے موٹر ایک گلی میں ٹھہرالی اور اکیلا سامنے والے مکان کی طرف بڑھا۔

میں نے پوچھا۔ ''یہ گلی کس طرف ہے۔''

نعیم نے جواب دیا۔ ''دادری میں ہے...... ادھر جہاں پارسیوں کے بے شمار مکان ہیں، غالباً اس کو پارسی کالونی کہتے ہیں۔''

...... ہاں تو عاشق حسین موٹر سے نکل کر سامنے مکان کی طرف بڑھا۔ ایک چھوٹا سا دو منزلہ مکان تھا۔ باغیچہ طے کر کے عاشق نے دروازہ پر دستک دی۔ جب کسی نے دروازہ نہ کھولا تو عاشق نے دوسری بار زور سے دست دی۔ اندر سے کسی عورت کی آواز آئی ''کون ہے۔'' عاشق حسین نے بلند آواز مین جواب دیا۔ ''عاشق!'' اندر سے خشم آلود آواز آئی۔ ''عاشق کی......'' عاشق حسین نے یہ

گالی سن کر ہماری طرف دیکھا اور زور سے دروازہ کھٹکھٹانا اور یہ کہنا شروع کیا۔

''دروازہ کھولو...... دروازہ کھولو۔''

یہ سن کر میں نے کہا۔''اس عورت نے شاید عاشق کا غلط مطلب سمجھا ورنہ جیسا کہ تم ابھی کہہ چکے ہو وہ عاشق کی شاگرد تھی۔''

''جانے بلا...... کیا تھی اور کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ عاشق حسین نے جھوٹ ہی بولا ہو اور بیئر کی ایک بوتل پینے کے بعد زہرہ کا خیال اس کے دماغ میں آ گیا ہو۔ کسی نے اس سے کبھی کہا ہو گا کہ فلاں نمبر کے فلیٹ میں ایک عورت زہرہ رہتی ہے ...... لیکن اس سے کیا بحث ہے ...... عاشق حسین نے اودھم مچانا شروع کر دی۔ اندر سے گالیاں آتی رہیں اور پیشتر اس کے کہ میں اسے منع کر سکتا۔ تین چار دھکے مار کر اس نے دروازہ توڑا اور زبردستی اندر داخل ہو گیا۔ جب یہ شور ہوا تو آس پاس کے رہنے والے پارسی اکٹھے ہو گئے۔ میں بے حد پریشان ہوا، چنانچہ اسی پریشانی میں موٹر سے باہر نکلا اور عاشق کو باہر لانے کی خاطر اس مکان میں داخل ہو گیا۔ میرے پیچھے پیچھے عاشق کے دونوں ساتھی بھی چلے آئے۔ میں نے اس فلیٹ کے تینوں کمرے دیکھے مگر نہ عاشق نظر آیا نہ اس کی شاگرد زہرہ۔ خدا معلوم کہاں غائب ہو گئے تھے۔ گھر کے پرلی طرف دوسرا راستہ تھا، ممکن ہے وہ ادھر سے باہر نکل گئے ہوں۔ میں چند منٹ ان تین کمروں میں رہا، جب کوئی سراغ نہ ملا تو باہر نکل کر موٹر میں بیٹھ گیا۔ وہ پارسی جو گلی میں جمع ہو گئے تھے گھور گھور کر میری طرف دیکھنے لگے۔ میں اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ بیئر کا سارا نشہ جو دماغ میں تھا اتر کر میری ٹانگوں میں چلا آیا۔ میرے جی میں آئی کہ عاشق، اس کے ساتھیوں اور ان کی موٹر کو وہیں چھوڑ

کر بھاگ جاؤں مگر...... عجیب مشکل میں میری جان پھنس گئی تھی۔ اگر بھاگنے کی کوششیں کرتا تو یقیناً وہ پارسی جو مجھے چڑیا گھر کا بندر سمجھ کر گھور رہے تھے پکڑ لیتے...... دس بارہ منٹ اسی شش و پنج میں گزر رے۔ اس کے بعد عاشق اور اس کے دونوں دوست مکان میں سے باہر نکلے اور موٹر میں بیٹھ گئے۔ میں نے عاشق سے کوئی بات نہ پوچھی۔ موٹر چلی اور جب دادر کا حلقہ آیا تو میں نے اس سے کہا مجھے یہیں اتار دو، میں بس میں گھر چلا جاؤں گا۔'' عاشق کے دماغ سے جوہو کی سیر کا خیال نکل گیا تھا، اس نے اپنے مارواڑی دوست سے موٹر روکنے کے لیے کہا، چنانچہ میں ان سے رخصت لے کر گھر چلا آیا اور اس واقعے کو بھول گیا۔

نعیم نے ایک اور سگریٹ سلگایا اور کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔ ''اس کے بعد کیا ہوا؟'' ''مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ نعیم نے بڑی تلخی کے ساتھ کہا۔ ''اس بیوقوف کے بچے عاشق حسین سے جب پولیس والوں نے پوچھا کہ تمہارے ساتھ اور کون تھا تو اس نے اپنے مارواڑی دوست، اس موٹر بنانے والے کا اور میرا نام لے دیا۔ ہم تینوں ایک گھنٹے کے اندر اندر گرفتار کر لیے گئے۔''

میں نے پوچھا۔ ''یہ کب کی بات ہے؟ تم نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی۔''

نعیم نے جواب دیا۔ کل دو ڈھائی بجے کے قریب ہماری گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ میں نے تمہیں ٹیلی فون پر ضرور مطلع کیا ہوتا اگر میرے حواس بجا ہوتے۔ بخدا میں سخت پریشان تھا۔ پولیس انسپکٹر ٹیکسی میں ہم سب کو تھانے لے گیا۔ وہاں بیانات قلمبند ہوئے تو مجھے پتا چلا کہ عاشق حسین کے وہ مارواڑی دوست جو کسی کاروبار کے سلسلے میں یہاں آئے تھے زہرہ کا پنکھا اٹھا کر اپنے ساتھ لے آئے

تھے۔ بجلی کا یہ پنکھا پولیس نے ان سے حاصل کر لیا تھا۔

یہ سن کر میں نے تشویشناک لہجہ میں کہا۔ ''اس سے تو چوری صاف ثابت ہوتی ہے۔''

''چوری ثابت ہوتی ہے جبھی تو میں اس قدر پریشان ہوں اور سچ پوچھو تو اگر یہ ثابت نہ بھی ہوتی تو میری پریشانی اسی قدر رہتی۔ تھانے اور عدالت میں جانا بے حد شرمناک ہے، پر اب کیا کیا جائے۔ جو ہونا ہے ہو چکا ہے۔ اس خفت سے چھٹکارا نہیں مل سکتا جو مجھے اٹھانا پڑے گی اور اٹھانا پڑ رہی ہے...... میں بالکل بے گناہ ہوں یعنی ظاہر ہے کہ زہرہ کو میں بالکل نہیں جانتا، اس کے مکان پر میں اگر گیا تو محض عاشق حسین کی وجہ سے اس چغد کے کہنے پر جو ایک بوتل بیئر بھی ہضم نہیں کر سکتا۔''

نعیم کے چہرے پر نفرت اور غصے کے ملے جلے جذبات دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ ''بھئی...... بہت برے پھنسے۔''

نعیم نے اسی انداز میں کہا۔ ''ہنسی میں پھنسی اسی کو کہتے ہیں...... کل...... اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے عدالت کا منہ دیکھا اور وہ زہرہ بھی پہلی مرتبہ مجھے نظر آئی۔''

میں نے فوراً ہی پوچھا۔ ''کیسی ہے؟''

نعیم نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''بری نہیں...... یعنی شکل صورت کے اعتبار سے اچھی خاصی ہے...... بیضوی چہرہ ہے جس پر کیلوں اور مہاسوں کے داغ نظر آتے ہیں۔ لمبے لمبے کالے بال ہیں۔ پیشانی تنگ ہے۔ جوان ہے۔ ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ حال ہی میں اس نے یہ دھندا شروع کیا ہے۔''

میں نے بغیر کسی مطلب کے یوں ہی پوچھا۔ ''کیسا دھندا؟''

نعیم نے شرما سا گیا۔ ''ارے بھئی...... وہی جو عورتیں کرتی ہیں۔ زہرہ کے چہرے پر اس کی چھاپ دور سے نظر آ سکتی ہے...... مجھے اس عورت پر اتنا غصہ کبھی نہ آتا مگر جب مجسٹریٹ نے میری طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ تم اس کو پہچانتی ہو۔'' تو زہرہ نے میری طرف اپنی بڑی بڑی ڈھلی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ ''ہاں صاحب! پہچانتی ہوں۔ اسی نے میرا چاندی کا ٹی سیٹ اٹھایا تھا۔ جب اس نے یہ جھوٹ بولا تو خدا کی قسم جی میں آئی ملعونہ کے حلق میں کٹہرے کا ایک ڈنڈا نکال کر ٹھونس دوں۔ اتنا بڑا جھوٹ!''

اس پر میں نے کہا۔ ''بھئی جھوٹ تو بولے گی۔ اس کے بغیر کام کیسے چلے گا۔ اسے اپنا کیس مضبوط بھی تو بنانا ہے...... اب تو تمہیں قہر درویش بر جان درویش سب کچھ سننا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' نعیم نے بڑی پریشانی کے ساتھ کہا۔ ''جو کچھ ہوگا اسے ہر حالت میں سہنا ہی پڑے گا مگر...... مگر...... میں کیا بتاؤں میں کس قدر پریشان ہو گیا ہوں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا...... اگر کسی مرد نے مجھ پر ایسا مقدمہ دائر کیا ہوتا تو مجھے اتنی پریشانی نہ ہوتی مگر ذرا غور تو کرو، وہ عورت ہے...... اور میں عورتوں کی تعظیم کرتا ہوں۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیوں؟''

نعیم نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ میں عورتوں کو جانتا ہی

نہیں۔ کسی عورت سے ملنے اور اس سے کھل کر بات چیت کرنے کا مجھے کبھی موقع ہی نہیں ملا۔ اب زندگی میں پہلی مرتبہ عورت آئی ہے تو مدعی بن کر۔"

میں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ نعیم نے اس پر بگڑ کر کہا۔ "تم ہنستے ہو مگر یہاں میری جان پر بنی ہے...... دو دن سے میں کمپنی نہیں جا رہا...... وہاں یہ بات ضرور پہنچ چکی ہو گی۔ سیٹھ صاحب کے سامنے کیا منہ لے کے جاؤں گا۔ انہوں نے اگر کچھ پوچھا تو میں کیا جواب دوں گا۔"

میں نے کہا۔ "جو اصل بات ہے ان کو بتا دینا۔"

"وہ تو میں بتا ہی دوں گا مگر خدا کے لیے سوچو تو سہی کہ میری پوزیشن کیا ہے ...... میں سیٹھ صاحب کی بے حد عزت کرتا ہوں اس لیے کہ وہ میرے آقا ہیں اگر انہوں نے مجھے بدکردار سمجھ کر برطرف کر دیا تو عمر بھر کے لیے میں داغدار ہو جاؤں گا۔ ملازمت کھونے کا مجھے اتنا افسوس نہیں ہو گا مگر یہاں سوال عزت و ناموس کا ہے...... وہ ضرور بدگمان ہو جائیں گے۔ میں ان کی طبیعت سے اچھی طرح واقف ہوں میری سچی باتوں کو بھی وہ جھوٹا ہی سمجھیں گے۔ فلم کمپنی میں ہر شخص جھوٹ بولتا ہے۔ وہ خود بھی ہمیشہ جھوٹ بولتے ہیں...... اب میں کیا کروں...... کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

میں نے ہر ممکن طریقے سے نعیم کی اخلاقی جرأت بڑھانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ وہ بے حد ڈرپوک ہے۔ خاص کر عورتوں کے معاملے میں تو اس کی بزدلی بہت ہی زیادہ ہے۔ دراصل معاملہ بھی سنگین تھا اگر برقی پنکھا برآمد نہ ہوتا تو کیس بالکل معمولی رہ جاتا۔ مگر پولیس اس مارواڑی سے پنکھا حاصل کر چکی تھی

اس لیے ظاہر ہے کہ زہرہ ایک حد تک بچی تھی۔

نعیم زیادہ دیر تک میرے پاس نہ ٹھہرا اور چلا گیا۔ دوسرے روز شام کو وہ پھر آیا۔ اس کی پریشانی اور بھی زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ آتے ہی کہنے لگا۔ ''بھائی! ایک مصیبت میں تو جان پھنسی تھی، اب ایک اور آفت گلے پڑ گئی ہے۔''

میں نے تشویش کے ساتھ کہا۔ ''کیا ہوا...... کیا کوئی اور کیس کھڑا ہو گیا۔''

''نہیں...... کیس وہی ہے، مگر ایک ایسی بات ہوئی ہے جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔'' نعیم نے کرسی پر بیٹھ کر اضطراب کے ساتھ ٹانگ ہلانا شروع کی۔ ''آج صبح سیٹھ صاحب نے مجھے بلانے کے لیے موٹر بھیجی۔ مجھے جانا ہی پڑا حالانکہ میں ارادہ کر چکا تھا کہ کبھی نہیں جاؤں گا۔ بخدا فلم کمپنی میں داخل ہوتے وقت میری حالت وہی تھی جو حساس ملزموں کی ہوتی ہے۔ شرم کے مارے میرا حلق سوکھ رہا تھا۔ سر بھاری ہو گیا تھا۔ نیچی نظریں کیے جب میں سیٹھ صاحب کے کمرے مین داخل ہوا تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ بڑے تپاک کے ساتھ انہوں نے پہلی مرتبہ میرے ساتھ ہینڈ شیک کیا اور ہنس کر کہنے لگے۔ منشی صاحب! آپ نے کمال کر دیا۔ آپ تو چھپے رستم نکلے۔ بیٹھئے تشریف رکھیے۔'' میں ندامت میں غرق کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی بیٹھ گئے۔ پھر انہوں نے ایسی باتیں شروع کیں کہ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ کہنے لگے۔ ''آپ گھبراتے کیوں ہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ بتائیے کہ یہ زہرہ ہے کیسی؟ کچھ اچھی ہے؟ بھئی آپ نے تو کمال کر دیا۔ میں سنتا ہوں کہ آپ نے پی کر وہ دھمال مچائی کہ پارسی کالونی کے سب آدمی اکٹھے ہو گئے۔ کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ زہرہ کی ساڑھی اتار کر لے گئے......

پہلے بھی تو آپ اس کے ہاں آتے جاتے ہوں گے پھر حرامزادی نے پولیس میں رپورٹ کیوں لکھوائی، پر کیا پتا ہے آپ نے بہت زیادہ شرارتیں کی ہوں۔" ایسی ہی بے شمار باتیں انہوں نے مجھ سے کیں۔ میں خاموش رہا۔ اس کے بعد انہوں نے چائے منگوائی۔ ایک پیالہ میرے لیے بنایا اور پھر وہی گفتگو شروع کر دی۔ "چاندی کا ٹی سیٹ جو آپ اٹھا کر لے گئے تھے، مجھے اگر آپ پریزنٹ کر دیں تو میں ابھی آپ کو اپنے وکیل کے پاس لے چلتا ہوں...... ایسی اچھی وکالت کرے گا کہ زہرہ کی طبیعت صاف ہو جائے گی...... میں سنتا ہوں زہرہ شکل صورت کی اچھی ہے، تو بھئی اس مقدمہ کے بعد اسے یہاں لے آؤنا۔ اپنے فلم میں اسے کوئی چھوٹا سا رول دے دیں گے...... اور ہاں، یہ آپ نے اچھا کیا کہ اسی کی شراب پی اور اسی کی چیزیں اڑا کر لے گئے...... پر آپ ایک درجن آدمی اپنے ساتھ کیوں لے گئے تھے؟ بے چاری اتنے آدمی دیکھ کر گھبرا گئی ہو گی۔" بات بات پر وہ ہنستے تھے جیسے گفتگو کے لیے انہیں ایک نہایت ہی دلچسپ موضوع مل گیا ہے۔ تعجب ہے کہ اس سے پہلے انہوں نے کبھی میرے سلام کا جواب بھی نہیں دیا تھا۔

میں نے کہا۔ "تو کیا ہوا۔ تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ وہ تم پر ناراض نہ ہوئے۔"

نعیم نے بگڑ کر کہنے لگا۔ "یہ بھی تم نے خوب کہا۔ کہ مجھے خوش ہونا چاہیے۔ وہ مجھے مجرم سمجھ رہے تھے جو کہ میں نہیں ہوں...... میں کیا کہہ سکتا تھا۔ خاموش رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے خزانچی کو بلایا اور مجھے سو روپے ایڈوانس دلوائے حالانکہ دو مہینے سے کسی ملازم کو تنخواہ نہیں مل رہی۔"

میں نے کہا۔ "تو کیا برا ہوا؟"

''ارے بھئی! تم ساری بات تو سن لو۔'' نعیم کھج گیا۔ سو روپے دلوا کر انہوں نے کہا۔ ''یہ آپ اپنے پاس رکھیے۔ آپ کو مقدمہ کے لیے ضرورت ہو گی۔ وکیل کا بندوبست میں ابھی کیے دیتا ہوں۔'' ٹیلی فون پر انہوں نے فوراً ہی وکیل سے بات کی، پھر مجھے اپنی موٹر میں بٹھا کر اس کے پاس لے گئے۔ ساری باتیں اس کو سمجھائیں اور کہا۔ ''دیکھیے، اس مقدمے میں جان لڑا دیجیے گا...... بات بالکل معمولی ہے، اس لیے کہ منشی صاحب سے زہرہ کے تعلقات بہت پرانے ہیں۔''

میں کیا کہتا۔ وہاں بھی خاموش رہا۔

میں نے ہنس کر نعیم سے کہا۔ ''اب بھی خاموش رہو۔ تمہارا کیا بگڑ گیا ہے؟''

نعیم اٹھ کھڑا ہوا اور اضطراب کے ساتھ ٹہلنے لگا۔ ''ابھی کچھ بگڑا ہی نہیں۔ عدالت میں مجھے بیان دینا پڑے گا کہ زہرہ میری داشتہ ہے اور میں اسے ایک مدت سے جانتا ہوں......اور......اور......سیٹھ صاحب نے آج شام مجھے مدعو کیا ہے۔ کہتے تھے گرین چلیں گے۔ وہاں کچھ شغل رہے گا......میری جان عجب مصیبت میں پھنس گئی ہے......سمجھ میں نہیں آتا کیا ہو رہا ہے۔''

پہچان

ایک نہایت ہی تھرڈ کلاس ہوٹل میں دیسی وسکی کی بوتل ختم کرنے کے بعد طے ہوا کہ باہر گھوما جائے۔ اور ایک ایسی عورت تلاش کی جائے جو ہوٹل اور وسکی کے پیدا کردہ تکدر کو دور کر سکے۔ کوئی ایسی عورت ڈھونڈی جائے جو ہوٹل کی کثافت کے مقابلے میں نفاست پسند اور بدذائقہ وسکی کے مقابلے میں لذیذ ہو۔

فخر نے ہوٹل کی غلیظ فضا سے باہر نکلتے ہی مجھ سے اور مسعود سے کہا۔ ''کوئی دانے دار عورت ہو...... اچھے گویے کے گلے کی طرح اس میں بڑے بڑے دانے ہوں...... خدا کی قسم طبیعت صاف ہو جائے۔''

وسکی دانوں سے بالکل خالی تھی۔ سوڈا بھی بالکل بے جان تھا۔ غالباً اسی وجہ سے فخر ''دانے دار عورت'' کا قائل ہو رہا تھا۔ ہم تینوں عورت چاہتے تھے۔ فخر دانے دار عورت چاہتا تھا۔ مجھے ایسی عورت مطلوب تھی جس میں بنیا پن نہ ہو اپنی فیس کے روپے لے کر ٹرنک میں یا جہاں اس کا جی چاہے رکھے اور کچھ عرصہ کے لیے بھول جائے کہ سودا کر رہی ہے۔

اس بازار کا راستہ جو ہم جانتے تھے جہاں عورتیں مل سکتی ہیں کالی، نیلی، پیلی، لال اور جامنی رنگ کی عورتیں۔ پیڑوں کی طرح ان کے مکان ایک قطار میں دور تک دوڑتے چلے گئے ہیں۔ یہ رنگ برنگی عورتیں ان میں پکے ہوئے پھلوں کے مانند لٹکی رہتی ہیں۔ آپ نیچے سے ڈھیلے اور پتھر مار کر انہیں گرا سکتے ہیں۔

ہمیں یہ عورتیں مطلوب نہیں تھیں۔ دراصل ہم اپنے آپ کو دھوکا دینا چاہتے

تھے ہم ایسی عورت یا عورتیں چاہتے تھے جو حرف عام میں ''پرائیویٹ ہوں'' یعنی جو منڈی کے ہجوم میں سے نکل کر علیحدہ شریف محلوں میں اپنا کاروبار چلا رہی ہوں۔

ہم تینوں میں فخر سب سے زیادہ تجربہ کار تھا۔ قوت ارادی بھی اس میں ہم سب سے زیادہ تھی۔ ایک تانگے والا جب ہمارے پاس سے گزرا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا اور بغیر کسی جھجک کے معنی خیز لہجے میں اس سے کہا۔

''ہم سیر کرنا چاہتے ہیں۔ چلو گے؟''

تانگے والا سنجیدہ اور متین آدمی معلوم ہوتا تھا ہم تینوں کی طرف باری باری دیکھا۔ میں جھینپ سا گیا خاموشی ہی خاموشی میں وہ ہم سے کہہ گیا تھا، تم نوجوانوں کو شراب پی کر یہ کیا ہو جاتا ہے؟

فخر نے دوبارہ اس سے کہا۔ ''ہم سیر کرنا چاہتے ہیں...... چلو گے؟'' پھر فوراً ہی اسے کچھ خیال آیا اور اپنا مطلب اور زیادہ واضح کر دیا۔ ''کوئی مال وال ہے تمہاری نگاہ میں؟''

مسعود اور میں دونوں ایک طرف کھسک گئے۔ مسعود نے گھبرا کر مجھ سے کہا۔

''یہ فخر کیا آدمی ہے اسے کچھ سمجھاؤ۔''

مسعود سے میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ فخر نے آواز دی۔ ''وسکی پینے کے باوجود ہمیں سردی محسوس ہو رہی تھی۔ چونکہ اگلی نشست پر تھا اور تینوں میں سب سے زیادہ کمزور تھا۔ اس لیے میرے کان سن ہو رہے تھے۔ جب تانگہ ڈفرن برج کے نیچے اترا تو میں نے مفلر نکال کر کانوں اور سر پر لپیٹ لیا اور اوور کوٹ کا کالر بھی اونچا کر لیا۔''

سانس گھوڑے کے نتھنوں سے بھاپ بن کر باہر نکل رہا تھا۔ ہم تینوں خاموش تھے۔ تانگے والا موٹے اور کھردرے کمبل میں لپٹا خاموشی سے اپنا تانگہ چلا رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ سنجیدگی اس کے چہرے پر ٹھٹھری سی رہی تھی۔ جو مجھے بہت بری معلوم ہوئی۔ چنانچہ میں نے فخر سے کہا۔ ''فخر یہ آدمی کیسا ہے...... کوئی بات ہی نہیں کرتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاسٹر آئل پی کر بیٹھا ہے۔''

تانگے والا میرے اس ریمارک پر بھی خاموش رہا۔ فخر نے کہا۔ ''زیادہ باتیں کرنے والے آدمی ٹھیک نہیں ہوتے۔ ہمارا مطلب سمجھ گیا ہے۔ لے چلے گا۔ جہاں بھی چیز اچھی ہوئی۔''

مسعود جو سگریٹ سلگا رہا تھا۔ ایک دم بولا۔ ایک دم بولا۔ ''واللہ عورت کتنی اچھی چیز ہے۔ عورت، عورت کم ہے چیز زیادہ ہے۔'' میں نے اس کو ذرا اور خوبصورت بنا کر کہا۔ ''مسعود! چیز نہیں...... چیزی۔''

شاعر آدمی تھا۔ پھڑک اٹھا۔ ''واللہ کیا بات پیدا کی ہے، چیز نہیں، چیزی...... سو میاں تانگے والے چیز اور چیزی میں فرق ہے۔ اس کا دھیان رکھنا۔'' تانگے والا خاموش رہا۔

اب میں نے اس کی طرف اور زیادہ غور سے دیکھا۔ مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ عمر پینتیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ پتلی پتلی مونچھیں تھیں۔ جن کے بال نیچے کو جھکے ہوئے تھے۔ سردی کے باعث چونکہ اس نے کمبل کا ڈھاٹا سا بنا رکھا تھا۔ اس لیے اس کا پورا چہرہ نظر نہ آتا تھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھ کر فخر سے پوچھا۔ ''کہاں لے جا رہے ہو ہمیں؟''

فخر نے جو زیادہ سوچ بچار کا عادی نہیں تھا۔ جواب دیا ''اتنے بیتاب کیوں ہوتے ہو؟ ابھی تھوڑی دیر کے بعد چیز تمہارے سامنے آ جائے گی۔''

مسعود نے اس پر فخر سے کہا۔ ''تم سے کیا بات ہوئی ہے اس کی؟''

فخر نے جواب دیا۔ ''روشن آرا روڈ پر...... کچھ میمیں رہتی ہیں۔ کہتا ہے ہمارے کام کی ہیں۔''

میموں کا نام سن کر مسعود اپنے دوست کی ایک نظم یاد آ گئی۔ اس کا حوالہ دے کر اس نے کہا۔

''تو چلو آج لگے ہاتھوں اربابِ وطن کی بےبسی کا انتقام بھی لے لیا جائے گا۔ واللہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تانگے والا صاحبِ ذوق ہے۔ وہ نظم ضرور پڑھی ہو گی اس نے۔''

اس کے بعد دیر تک میموں کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ میں اور مسعود میموں کے بالکل قائل نہیں تھے۔ لیکن فخر کو عورتوں کی یہ قسم پسند تھی۔ ''ان کا علم سائنٹیفک ہوتا ہے۔ یعنی یہ عورتیں سائنٹیفک طریقے پر اپنا کاروبار چلاتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں مشرقی عورتوں کو دیکھئے تو وہی فرق نظر آئے گا۔ جو ہمارے یہاں کی ریوڑھی اور وہاں کی ٹافی میں ہے۔ بھئی دراصل بات یہ ہے کہ ان میموں کا پیکنگ بڑا اچھا ہوتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''فخر! ممکن ہے تمہارا نظریہ درست ہو مگر بھائی! میں ایسے موقعوں پر زبان کی مشکلات برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اپنے دفتر میں بڑے صاحب کے ساتھ انگریزی بول سکتا ہوں۔ میں یہاں دہلی میں رہ کر اس تانگے والے سے اردو میں بات چیت کرنا گوارا کر سکتا ہوں۔ مگر اس موقع پر انگریزی میں گفتگو نہیں کر

سکتا۔ میری پتلون انگریزی، میری ٹائی انگریزی، میرا شو انگریزی...... یہ سب چیزیں انگریزی ہوسکتی ہیں۔ مگر خدا کے لیے وہ چیز مجھ سے انگریزی میں کیسے ہو سکتی ہے۔''

فخر اپنا نظریہ بھول کر ہنسنے لگا۔ مسعود شاید ابھی تک اپنے دوست کی لکھی ہوئی نظم پر غور کر رہا تھا۔ جس میں شاعر نے ایک فرنگی عورت کے ہونٹ چوس کر ارباب وطن کی بے بسی کا انتقام لیا تھا۔ دفعتاً چونک کر اس نے کہا۔ ''کیوں بھئی! یہ تانگہ کب تک چلتا رہے گا؟''

تانگے والے نے ایک دم باگیں کھینچ کر تانگہ ٹھہرا دیا اور فخر سے کہا۔ ''وہ جگہ آ گئی صاحب! آپ اکیلے چلیے گا یا......''

ہم تینوں تانگے والے کے پیچھے پیچھے چل دیئے۔

ایک نیم روشن گلی میں وہ ہمیں لے گیا۔ دلی کی دوسری گلیوں سے یہ گلی کچھ مختلف تھی۔ اس لیے بہت چوڑی تھی۔ دائیں ہاتھ کو ایک منزلہ مکان تھا۔ جس کی کھڑکیوں اور دروازوں پر چقیں لٹکی ہوئی تھیں۔ ایک دروازے کی چق اٹھا کر تانگے والا اندر داخل ہو گیا۔ چند لمحات کے بعد باہر آیا اور ہمیں اندر لے گیا۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے جب کہا۔ ''بھائی ہم کہیں اوندھے منہ نہ گر پڑیں۔'' تو دوسرے کمرے سے کسی عورت کی بھدی آواز سنائی دی۔ ''لالٹین تو لے گیا ہوتا تو'' اور تھوڑی دیر کے بعد تانگے والا ایک اندھی سی لالٹین لے کر نمودار ہوا۔ ''چلیے اندر تشریف لے چلیے۔'' ہم تینوں اندر تشریف لے گئے دو کالی بھجنگی، انتہائی بدصورت عورتیں نظر آئیں جنہوں نے ڈھیلے ڈھیلے فراک پہن

رکھے تھے۔ یہ میمیں تھیں۔ میں نے اپنی ہنسی روک کر فخر سے کہا۔ ''کیا لذیذ نافیاں اور بسکٹ ہیں۔''

میری یہ بات سن کر ان میموں میں سے ایک جس کا چہرہ سرخی لگانے کے باعث زیادہ پکی ہوئی اینٹ کی سی رنگت اختیار کر گیا تھا۔ ہنسی...... میں بھی ہنس دیا اور بڑے پیار سے پوچھا۔ ''کیا نام ہے آپ کا؟''

بولی۔ ''لوسی۔''

شاعر مسعود نے آگے بڑھ کر دوسری سے پوچھا۔ ''آپ کا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میری۔''

فخر بھی آگے بڑھ آیا۔ ''کیوں صاحب آپ کام کیا کرتی ہیں؟''

دونوں لجا گئیں۔ ایک نے ادا سے کہا۔ ''کیسا بات کرتا ہے تم؟''

دوسری نے کہا۔ ''جلدی کرو۔ رہنا مانگتا ہے یا نہیں۔ ہمیں روٹی پکانا ہے۔''

میں نے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو گیلے آٹے سے بھرے ہوئے تھے اور وہ اس کی مروڑیاں بنا رہی تھی۔ تانگے والا قطعی طور پر ہمیں غلط جگہ لے آیا تھا۔ مروڑیاں اس کے ہاتھوں سے کچے فرش پر گر رہی تھیں اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اناج رو رہا ہے اور یہ مروڑیاں اس کے آنسو ہیں۔

ہم تینوں کے اس مکان میں آ کر سخت پریشان ہو گئے۔ مگر ہم اپنی پریشانی ان دو عورتوں پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ہمیں سخت ناامیدی ہوئی تھی اگر ہم ان سے صاف لفظوں میں کہہ دیتے کہ تم ہمارے مطلب کی نہیں ہو تو ضرور ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی۔ عورت جس کے ہاتھ آٹے میں لتھڑے ہوں ایسے جذبات

سے عاری نہیں ہو سکتی۔

میں نے ان دونوں کی تعریف کی۔ فخر نے بھی میرا ساتھ دیا۔ پھر ہم تینوں جلد واپس آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے نکل گئے۔ تانگے والا ہمارا مطلب سمجھ گیا تھا چنانچہ اسے چند لمحات کے لیے وہاں ٹھہرنا پڑا۔ جب وہ باہر نکلا تو فخر نے اس سے کہا۔ ''تم انہیں میمیں کہتے ہو؟''

تانگے والے نے بڑی متانت کے ساتھ جواب دیا۔ ''لوگ یہی کہتے ہیں صاحب!'' وہ لوگ جھک مارتے ہیں...... میں نے خیال کیا تھا کہ تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے...... اب خدا کے لیے کسی ایسی جگہ لے چلو جہاں ہم چند گھڑیاں اپنا دل بہلا سکیں۔

مسعود نے تینوں کا اجتماعی مقصد اور زیادہ واضح کرنے کی کوشش کی۔ ''دیکھو ہم ایسی جگہ جانا چاہتے ہیں جہاں کچھ عرصے کے لیے بیٹھ سکیں...... ہمیں ایسی عورت کے پاس لے چلو جو باتیں کرنے کا سلیقہ رکھتی ہو...... بھائی ہم گورے نہیں ہیں۔ کسی فوج کے سپاہی نہیں ہیں۔ تین شریف آدمی ہیں جنہیں عورت سے بات چیت کیے برسوں گزر چکے ہیں...... سمجھے؟''

تانگے والے نے اس بات میں سر ہلا دیا۔ ''تو چلیے...... بیٹھیے...... آپ کو صدر بازار لے چلتا ہوں۔''

فخر نے پوچھا۔ ''کون ہے وہاں؟''

تانگے والے نے گھوڑے کی باگیں تھام کر جواب دیا۔ ''ایک پنجابن ہے بہت لوگ آتے ہیں اس کے پاس۔''

تانگے والے نے پنجابن کے گھر کا رخ کیا۔

راستے میں ان دو میموں کا ذکر چھڑ گیا۔ ہم میں سے ہر ایک کو وہاں جانے کا افسوس تھا۔ اس لیے کہ ہم سب سے زیادہ وہ نا امید ہوئی تھیں۔ میں نے ان کو کچھ روپے دے دیئے ہوتے۔ مگر یہ بھیک ہو جاتی ...... فخر نے ہماری اس گفتگو میں زیادہ حصہ نہ لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان کا ذکر نہ کیا جائے لیکن جب تک تانگہ پنجابن کے گھر تک نہ پہنچا۔ ان کا ذکر ہوتا رہا۔

تانگہ ایک فراخ بازار میں فٹ پاتھ کے پاس رکا۔ طویلے کے ساتھ والا مکان تھا۔ جدھر کا ہم چاروں نے رخ کیا۔ زینہ طے کر کے ہم اوپر پہنچے۔ سامنے پاخانہ تھا دروازے سے بے نیاز ...... اس کے ساتھ ہی پرانی وضع کا مغلئی کمرہ تھا۔ جس میں ہم چاروں داخل ہوئے۔ اس کمرے کے آخری سرے پر چار آدمی بیٹھے فلاش کھیلنے میں مصروف تھے۔ جو ہماری آمد سے غافل رہے۔ البتہ وہ عورت جوان کے پاس کھڑی تھی اور ایک آدمی کے پتوں میں دلچسپی لے رہی تھی آہٹ پا کر ہماری طرف آئی۔

یہاں بھی لالٹین کی مدھم روشنی تھی۔ جس کو فلاش کھیلنے والے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ جب وہ فخر کے پاس آئی اور کولہے پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی تو میں نے غور سے اسے دیکھا ...... اس کی عمر کم از کم 35 برس کے قریب تھی چھاتیاں بڑی بڑی تھیں۔ جو اس نے بڑے ہی بیہودہ اور فحش انداز سے اوپر کو اٹھا رکھی تھیں۔ تنگ ماتھے پر نیلے رنگ کا چاند کھدا ہوا تھا۔ جب وہ مسعود کی طرف دیکھ کر مسکرائی تو مجھے اس کے سامنے کے دو دانتوں میں سونے کی کیلیں نظر آئیں ......

بڑی خوفناک عورت تھی اس کا منہ کچھ اس انداز سے کھلتا تھا جیسے لیموں نچوڑنے

والی مشین کا کھاتا ہے۔

اس نے فخر کو آنکھ ماری اور پوچھا۔ ''کہو کیا بات ہے؟''

فخر نے بچے کی طرح کہا۔ ''آپ کا نام؟''

اس نے کولہے پر ہاتھ رکھے۔ ہم تینوں کو باری باری سے دیکھا۔ ''گلزار۔''

فخر نے فوراً ہی معذرت کی۔ ''ہم گلاب کے یہاں آئے تھے۔ غلطی سے ادھر چلے آئے معاف کر دیجیے گا۔''

یہ سن کر وہ فخر کے ہاتھ سے سگریٹ چھین کر کش لگاتی فلاش کھیلنے والوں کے پاس چلی گئی۔ جو ابھی تک ہماری آمد سے غافل تھے۔ نیچے اتر کر ہم تینوں نے تانگے والے کو پھر اپنا مطلب سمجھایا اور اس کو بتایا کہ ہم کس قسم کی عورت چاہتے ہیں اس نے ہم تینوں کا لیکچر سنا اور کہا۔ ''آپ تھوڑے لفظوں میں مجھے بتائیے۔ کہ آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟''

فخر نے اسے سمجھایا۔ ''دیکھو ہمیں کسی لڑکی کے پاس لے چلو...... ایسی عورت کے پاس جو سولہ سترہ برس کی ہو۔ اس سے زیادہ کی ہرگز نہ ہو سمجھے؟''

تانگے والے نے کمبل کی بکل مار کے باگیں تھامیں۔ ''آپ نے پہلے ہی کہہ دیا ہوتا چلیے...... اب آپ کو ٹھیک جگہ پر لے چلوں گا۔''

آدھ گھنٹے کے بعد ٹھیک جگہ بھی آ گئی...... خدا معلوم کون سا بازار تھا۔ دوسری منزل پر ایک بیٹھک سی تھی جس کے دروازے پر موٹا اور میلا ٹاٹ لٹک رہا تھا۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو سامنے آنگن میں ایک دیہاتی بڑھیا چولہا جھونک رہی تھی...... مٹی کے کونڈے میں گندھا ہوا آٹا پاس ہی پڑا تھا۔ دھواں اس قدر تھا کہ

اندر داخل ہوتے ہی ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

بڑھیا نے چولہے میں لکڑیاں جھاڑ کر ہماری طرف دیکھا اور تانگے والے سے دیہاتی لہجے میں کہا۔ ”انہیں اندر لے جاؤ۔“

تانگے والے نے اندھیرے کمرے میں دیا سلائی جلا کر ہمیں داخل کیا اور کیل سے لٹکی ہوئی لالٹین کو روشن کر کے باہر چلا گیا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کونے میں ایک بہت بڑا پلنگ تھا۔ جس کے پائے رنگین تھے۔ اس پر میلی سی چادر بچھی ہوئی تھی۔ تکیہ بھی پڑا تھا۔ جس پر سرخ رنگ کے پھول کڑھے ہوئے تھے۔ پلنگ کے ساتھ والی دیوار کی کانس پر تیل کی ایک میلی بوتل اور لکڑی کی کنگھی پڑی تھی۔ اس کے دانتوں میں سر کا میل اور کئی بال پھنسے ہوئے تھے۔ پلنگ کے نیچے ایک ٹوٹا ٹرنک تھا۔ جس پر ایک کالی گر کابی رکھی ہوئی تھی۔

مسعود اور فخر دونوں پلنگ پر بیٹھ گئے۔ میں کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک پست قد لڑکی اپنے سے دوگنا دوپٹہ اوڑھنے کی کوشش کرتی اندر داخل ہوئی۔ فخر اور مسعود دونوں اٹھ کھڑے ہوئے جب وہ لالٹین کی روشنی میں آئی تو میں نے اسے دیکھا اس کی عمر بمشکل 12 برس کے قریب ہوگی۔ چھاتیاں آڑو کے برابر تھیں۔ مگر اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے جسم کو پیچھے چھوڑ کر بہت آگے نکل چکی ہے۔ بہت آگے جہاں شاید اس کی ماں بھی نہیں پہنچ سکی۔ جو باہر آنگن میں چولہا جھونک رہی تھی۔ اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ اور اس انداز سے اپنا ایک ہاتھ ہلا رہی تھی جیسے مکار دکاندار کی طرح ڈنڈی مارے گی اور کبھی پورا تول نہیں تولے گی۔

ہم تینوں اس کو حیرت بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔ فخر شرم بھی محسوس کر رہا

تھا۔ مسعود کی ساری شاعری سمٹ کر شاید اس کے ناخنوں میں چلی گئی۔ کیونکہ وہ بری طرح انہیں دانتوں سے کاٹ رہا تھا۔

میں نے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا جیسے مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ ٹھنگنی سی لڑکی تھی۔ جو ایک بہت بڑا میلا دوپٹہ اوڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ رنگ گہرا سانولا، بدن کی ساخت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بڑی تیزی سے چلی ہوئی گاڑی ہے جو ایک دم رک گئی ہے۔ اس کے پہیوں میں بریک لگ گئے ہیں اور وہیں کھڑے کھڑے اس کا رنگ و روغن دھوپ اور بارش میں اڑ گیا ہے۔ اس عمر میں بھدی سی بھدی لڑکی کے جسم میں ایک قسم کی شوخ جاذبیت ہوتی ہے۔ اس میں بالکل نہیں تھی۔ کپڑوں کے باوجود وہ ننگی دکھائی دیتی تھی۔ بہت ہی بیہودہ اور ناواجب طریقے پر ننگی .... اس کے جسم کا نچلا حصہ قطعی طور پر سے غیر نسوانی تھا۔

میں اس سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس کے عقب سے ایک بڈھا نمودار ہوا۔ بالکل سفید ڈاڑھی سر ضعف کے باعث ہل رہا تھا۔ لڑکی نے دیہاتی زبان میں ان سے کچھ کہا۔ جس کا مطلب میں صرف اس قدر سمجھا کہ وہ بڈھا اس کا نانا ہے۔

ہم تینوں صحیح معنوں میں اٹھ بھاگے۔ نیچے بازار میں پہنچے تو ہمارا تکدر کچھ دور ہوا۔

بڈھے اور لڑکی کو دیکھ کر ہمارے جمالیاتی ذوق کو بہت ہی شدید صدمہ پہنچا تھا۔ دیر تک ہم چپ چاپ رہے۔

فخر ٹہلتا رہا۔ مسعود ایک کونے میں پیشاب کرنے کے لیے بیٹھ گیا۔ میں او ور

کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اوپر آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ جہاں نامکمل چاند بالکل اس زرد بیسوا لونڈیا کی طرح جس کے جسم کا نچلا حصہ قطعی طور پر غیر نسوانی تھا۔ بادل کے ایک بڑے ٹکڑے کا دوپٹہ اوڑھنے کی کوشش کر رہا تھا...... اس سے کچھ دور ایک چھوٹا سفید ٹکڑا اس کے نانا کے ضعیف سر کی طرح لرز رہا تھا

....

میرے بدن پر جھرجھری طاری ہوگئی۔

ہم غالباً دس بارہ منٹ تک بازار میں کھڑے رہے اس کے بعد تانگے والا نیچے اترا فخر کے پاس جا کر اس نے کہا۔ ''آپ نے آٹھ بجے تانگہ لیا تھا...... اب گیارہ بج چکے ہیں تین گھنٹوں کے پیسے دے دیجیے۔''

فخر نے کچھ کہے بغیر دو روپے اس کو دے دیئے۔ روپے لے کر وہ مسکرایا۔

''بابو! آپ کو کچھ پہچان نہیں...... ایسی کراری لونڈیا تو شہر بھر میں نہیں ملے گی آپ کو...... خیر آپ کو اختیار...... تانگے میں بیٹھے میں ابھی آیا۔''

اس کو اوپر جانے کی زحمت نہ اٹھانا پڑی۔ کیونکہ سفید ریش بوڑھا اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا تھا اور موری کے پاس کھڑا اپنا ضعیف سر ہلا رہا تھا۔ اس کو دو روپے دے کر جب تانگے والے نے باگیں تھامیں تو اس کی سنجیدگی غائب تھی۔ ''چل بیٹا'' کہہ کر اس نے اپنی بھدی مگر مسرت بھری آواز میں گانا شروع کر دیا۔

''ساون کے نظارے ہیں...... اللا......''

اختتام ــــــــــــــــــــــــ حصہ اول